تفقہ فی الدین کی روایت کا علم بردار

ماہنامہ

مفاہیم

کراچی

جنوری ۲۰۲۲ء

جلد ۲

فقہ اکیڈمی کا ترجمان

شمارہ ۲

لیتفقہوا فی الدین

فقہ اکیڈمی

لِيَتَفَقَّهُوا فِي الدِّينِ

زاجتہادِ عالمانِ کم نظر
اقتدا بر رفتگان محفوظ تر

اقبال

مَن يُرِدِ اللهُ بِهِ خَيْرًا يُفَقِّهْهُ فِي الدِّينِ

ماہ نامہ

مفاہیم

کراچی

فقہ اکیڈمی کا ترجمان | تفقہ فی الدین کی روایت کا علم بردار

مجلسِ مشاورت

- حافظ محمد موسیٰ بھٹو صاحب
- ڈاکٹر محمد رشید ارشد
- مفتی اویس پاشا قرنی
- مولانا معراج محمد
- حافظ سید اسامہ علی
- استاذ ابرار حسین
- استاذ عابد علی بھٹی

سرپرستِ اعلیٰ

حضرت مولانا مفتی نذیر احمد ہاشمی صاحب حفظہ اللہ

مدیر

صوفی جمیل الرحمن عباسی

نائب مدیر

حافظ حماد احمد ترک

فقہ اکیڈمی

C-335، بلاک-1، گلستان جوہر، بالمقابل جامعہ کراچی، یونیورسٹی روڈ، کراچی، پاکستان۔ 3474 3662 21 92 + | 3474 3661 21 92 +

FIQHACADEMY.COM.PK FIQHACADEMY FIQHACADEMYPK +92 330 3474223

مضامین

نعت	نہ کوئی دل ساغنی ہے نہ کوئی دل سافقیر	احمد جاوید	۴
اداریہ	سانحۂ سیالکوٹ سے بڑا سانحہ	مدیر	۷
درسِ قرآن	سورۃ النساء آیت: ۱۱۴	مولانا محمد اقبال	۱۲
درسِ حدیث	بردباری	ابنِ عباس	۱۶
	آہ! حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی	شیخ الاسلام حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی	۲۰
مقالات	خواطرِ ایام	مفتی اویس پاشا قرنی	۲۹
	بیت المقدس کا تاریخی خاکہ (۷)	صوفی جمیل الرحمن عباسی	۳۵
یسئلونک	دوسرے شہر میں قصر کا حکم	دارالافتاء، فقہ اکیڈمی	۴۲
ادبیات	نظم: اے شعاعِ سحرِ تازہ	احمد فراز	۴۳

احمد جاوید
معروف شاعر، نقاد اور دانشور

نہ کوئی دل سا غنی ہے نہ کوئی دل سا فقیر

نہ کوئی دل سا غنی ہے نہ کوئی دل سا فقیر
اُن کے الطاف کے بعد اُن کی عطا سے پہلے

قلبِ صدیق و عمر، سینۂ عثمان و علی
چمنِ عشق ہیں ایجادِ صبا سے پہلے

دل نے سو بار سنی غیب سے آوازِ قبول
ایک، بس ایک، فقط ایک دعا سے پہلے

دعوۂ عشقِ رسالت میں نہ جلدی کیجے
اس کی توثیق تو ہو خوفِ خدا سے پہلے

کچھ نہ تھے انفس و آفاق زمین و افلاک
ان کے نور، ان کے ظہور، ان کی صبا سے پہلے

کچھ نہیں، ہاں! بخدا کچھ بھی نہیں دیدہ و دل
ان کے دیدار سے قبل، ان کی لقا سے پہلے

عازمِ طیبہ پہ لازم ہے کہ آدابِ سفر
پوچھ کر نکلے کسی مردِ خدا سے پہلے

دیکھا جاتا ہے وہاں دیدۂ تر، قلبِ سلیم
ریش و سجادہ و دستار و قبا سے پہلے

ہوس جاہ کہاں، عشقِ شہنشاہ کہاں
سینہ خالی تو کرو کبر و ریا سے پہلے

دشتِ پُرخارِ محبت میں قدم رکھتے وقت
پوچھ ہی لیتے کسی آبلہ پا سے پہلے

دل میں اک مہرِ جہاں تاب ہے جو بہرِ طلوع
اذن لیتا ہے شہِ ہر دوسرا سے پہلے

میں تو بس چشمِ ندامت سے انھیں دیکھوں گا
وزنِ اعمال سے، اعلانِ سزا سے پہلے

صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

*****

مدیر

ماہنامہ مفاہیم، کراچی

سانحۂ سیالکوٹ سے بڑا سانحہ

تھوڑے پرانے وقتوں میں کہا جاتا تھا "کیا بات ہوئی کس طور ہوئی اخبار سے لوگوں نے جانا" لیکن پریانتھا کمارا کے قتل کی خبر "سماجی ربط گاہوں" (سوشل میڈیا) پر، گردش کرنے والی وڈیوز سے پھیلی۔ یہ ۳ دسمبر ۲۰۲۱ء کا واقعہ ہے جس کے فوری بعد اس ظالمانہ فعل کی جاہلانہ وڈیوز پھیلائی جانے لگیں۔ آنجہانی پریانتھا کمارا، سری لنکن شہری اور راجکو انڈسٹریز سیالکوٹ کے محنتی اور سخت گیر پروڈکشن منیجر تھے۔ پولیس تحقیق کے مطابق ان کی پیشہ ورانہ ڈانٹ ڈپٹ کا انتقام لینے کے لیے فیکٹری کے ایک سپروائزر نے ان پر توہینِ مذہب یا توہینِ رسالت کا جھوٹا الزام لگا کر دوسرے کارکنوں کے جذبات کو بھڑکایا۔ مشتعل کارکنوں نے لاتوں، مکوں اور ڈنڈوں سے انھیں پیٹا اور پسِ انتقال ان کی لاش سڑک پر پھینک کر آگ لگا دی۔ اس واقعہ کو سانحہ کا نام بجا طور پر دیا گیا۔ سپہ سالاروں اور حکمرانوں سمیت تمام طبقات نے اس حادثے پر رنج و غم کا اظہار کیا۔ جید علمائے کرام، مثلاً مولانا فضل الرحمن صاحب، مولانا مفتی منیب الرحمن صاحب، مولانا محمد تقی عثمانی صاحب، مولانا قاری حنیف جالندھری صاحب، پروفیسر ساجد میر صاحب، مولانا ابوالخیر زبیر صاحب، مولانا طارق جمیل صاحب اور تحریک لبیک پاکستان کے ترجمان نے واشگاف الفاظ میں اس کی مذمت کی۔ ان حضرات کے فرامین کا خلاصہ یہ ہے کہ توہینِ ناموسِ رسالت عظیم جرم ہے لیکن توہینِ ناموسِ رسالت کا غلط الزام بھی سنگین جرم ہے جس کی قرار واقعی سزا دینی چاہیے۔ البتہ اس واقعے کی آڑ میں توہینِ ناموسِ رسالت و توہینِ مذہب کے قوانین کو نشانہ بنانا بھی قابلِ مذمت ہے اس لیے کہ قانونِ توہینِ ناموسِ رسالت و توہینِ مذہب انسانی جانوں کے تحفظ اور ملک میں امن و استحکام کا ذریعہ ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں بعض مذہبی طبقات میں

متشدد عناصر پائے جاتے ہیں اور جدید تعلیم یافتہ، سیکولر اور لبرل طبقات اگر مذہبی طبقے کو شدت پسندی کے خاتمے کا وعظ و نصیحت کریں تو یہ بھی امر جائز ہے لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ ان کا وعظ، طعن کی حد تک جا پہنچا ہے ایسے میں ہم یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتے کہ ان روشن خیالوں کا حال ''چہرہ روشن اندروں چنگیز سے تاریک تر'' سے بھی برا ہے۔

چراغ سامنے والے مکان میں بھی نہ تھا　　　یہ سانحہ مرے وہم و گمان میں بھی نہ تھا

ہم اس کی کچھ مثالیں پیش کرنا چاہتے ہیں اگرچہ ان سیاسی مثالوں میں کسی کی جان نہیں لی جا رہی جیسا کہ سانحہ سیالکوٹ میں ہوا لیکن دونوں کی اصل ایک ہے اور وہ ہے عدمِ برداشت:

۱۵ جون ۲۰۲۱ء کو قومی اسمبلی میں ہنگامہ آرائی ہوئی۔ پی ٹی آئی اور مسلم لیگی اراکین باہم گتھم گتھا ہو گئے ایک دوسرے کو ننگی گالیاں دی گئیں اور بھاری بجٹ کی بھاری کاپیوں سے ایک دوسرے کے گال لال کیے گئے۔ ایک خاتون رکن کی آنکھ زخمی ہو گئی۔ ایک وزیر صاحب نے یہ فرمایا کہ ایسے جھگڑے کوئی بڑی بات نہیں ہماری اسمبلی میں تو ایک رکن کو جان سے بھی مارا جا چکا ہے۔ ان کا اشارہ ڈپٹی سپیکر مسٹر شاہد علی خان کی طرف تھا جو ۱۹۵۸ء میں مشرقی پاکستان کی صوبائی اسمبلی میں جھگڑے کے دوران زخمی ہو کر چند روز بعد چل بسے تھے۔

جون ۲۰۲۱ء ہی میں پی ٹی آئی کی ایک طاقت ور، رکنِ اسمبلی اور پیپلز پارٹی کے رکنِ اسمبلی میں ٹی وی شو کے دوران نازیبا کلمات کا تبادلہ ہوا جس پر خاتون رکنِ اسمبلی نے دوسرے معزز رکنِ اسمبلی کو ایک زور دار چانٹا رسید کر دیا۔

فروری ۲۰۲۱ء میں بھی قومی اسمبلی میں دھکم پیل ہوئی سپیکر کا مائیک اتار لیا گیا اور بعض اراکین کو دھکے دے کر زمین چاٹنے پر مجبور کر دیا گیا۔

۱۸ مئی ۲۰۱۸ء کو پنجاب اسمبلی میں پی ٹی آئی اور مسلم لیگ نون کے اراکین کے درمیان جھگڑا ہوا اور باہم گتھم گتھا ہو گئے۔

مارچ ۲۰۱۲ء، پنجاب اسمبلی میں خواتین کی طرف سے بعض اراکین پر جوتے اچھالے گئے۔ ایک ممبر کے کپڑے پھاڑ دیے گئے۔

مارچ ۲۰۱۱ء میں پنجاب اسمبلی کی لابی میں پیپلز پارٹی کی دو خواتین رکن آپس میں لڑ پڑیں گالیوں، بال نوچنے، تھپڑ مارنے اور

گملے اٹھا کر مارنے کے دلدوز مناظر ناظرین کو دیکھنے کو ملے۔

اکتوبر ۲۰۱۱ء، قومی اسمبلی میں ایم کیو ایم اور مسلم لیگ کے اراکین دست و گریبان ہو گئے اور ایک دوسرے کو گالیوں اور دھکوں سے نوازا۔

اب ذرا، اسمبلیوں سے باہر کا حال دیکھیں تو:

۲۰۱۰ء میں سیالکوٹ کے ایک گاؤں میں دو حافظِ قرآن بھائیوں پر ڈکیتی کا الزام لگا کر ایک ہجوم نے ڈنڈوں سے پیٹ پیٹ کر ہلاک کر دیا اور بعد میں ان کی نعشوں کو چوراہے پر لٹکا دیا گیا۔ یاد رہے کہ یہ اندوہناک واقعہ ایک پولیس آفیسر اور آٹھ سپاہیوں کی موجودگی میں ہوا تھا۔

۲۰۱۷ء میں خان عبدالولی خان یونی ورسٹی کے طالبِ علم پر توہینِ مذہب کا جھوٹا الزام لگا کر قتل کر دیا گیا تھا۔ اس قتل میں مقامی کونسلر بھی ملوث پائے گئے تھے۔

۲۰۱۵ء میں یوحنا آباد میں عیسائیوں کے ایک مشتعل ہجوم نے بابر نعمان اور حافظ نعیم کو تشدد کا نشانہ بنانے کے بعد تیل چھڑک کر آگ لگا دی تھی۔

اب آخر میں مذہبِ اسلام کے نام پر ہونے والے دو واقعات پیش کرتے ہیں:

لاہور کے قریبی علاقے کوٹ رادھا کشن میں ایک جوان عیسائی جوڑے کو قرآنِ کریم کے اوراق جلانے کے جرم میں، ایک اینٹوں کے بھٹے میں پھینک کر زندہ جلا دیا گیا تھا۔ یہ وہ واقعہ ہے جس کی پشت پر ایک مولوی صاحب کی طرف سے مساجد میں غیر ذمے دارانہ اعلانات شامل ہیں۔

پنجاب کی صوبائی وزیر، ظلِ ہما عثمان کو ۲۰۰۷ء کو گجرانوالہ میں محمد سرور نامی شخص کی طرف سے قتل کر دیا گیا۔ قاتل کا کہنا تھا کہ سیاست میں حصہ لے کر ظلِ ہما نے اللہ تعالیٰ کے احکام کی خلاف ورزی کی ہے جس کی سزا اسے دے دی گئی ہے۔ پولیس کا یہ بھی ماننا تھا کہ اس شخص کا کسی مذہبی تحریک یا جماعت سے کوئی تعلق ثابت نہیں ہو سکا۔

یہ درست ہے کہ ان پر تشدد واقعات کی پشت پر کوئی مسلک و مذہب یا علمائے کرام کا کوئی گروپ یا کوئی غیر سرکاری

تنظیم نہیں ہے۔ہم کہہ سکتے ہیں کہ ﴿فَعَلَ السُّفَهَاءُ مِنَّا﴾ ”ہمارے بے وقوف لوگوں نے یہ کام کیا ہے“ لیکن اپنے بے وقوفوں کو روکنا بھی تو ہمارا ہی کام ہے: ﴿وَلَا تُؤْتُوا السُّفَهَاءَ﴾ ”مت دو بے وقوفوں کو۔۔۔“۔ہمیں بے وقوف لوگوں کے اسراف اور ظلم و زیادتی کو روکنے کا حکم بھی تو دیا گیا ہے: «تَأْخُذُوا عَلَى يَدِ الظَّالِمِ» ”ظالم کا ہاتھ روک دیا کرو“۔(سنن ترمذی) تو ہم بہ حیثیتِ قوم و ریاست اس فریضے کی ادائیگی میں ناکام رہے ہیں۔نہی عن المنکر دین کا ایک مستقل موضوع ہے لیکن اب اس کا حوصلہ عوام چھوڑ خواص میں بھی نہیں رہا۔اس میں جتنا دخل ہمارے زوالِ دین داری کو ہے اس سے زیادہ کھلا قصور ہماری حکومتوں کا ہے۔جب سے جنرل مشرف نے میراتھن ریس پر اعتراض کرنے والوں کو آنکھیں بند کرنے کا مشورہ دیا تب سے حکومت اور انتظامیہ کی طرف سے اسی رویے کی حوصلہ افزائی ہو رہی ہے کہ ” تجھے پرائی کیا پڑی اپنی نبیڑ تُو“ تو جب ملک کا نظام ایسا ہو کہ کسی ظالم کسی مافیا اور کسی ہائی پروفائل کے خلاف گواہی دینے یا اس کے خلاف تفتیشی افسر بننے یا اس کے خلاف وکیل بننے پر نہ صرف جان و خاندان کے نقصان کی دھمکیاں دی جائیں بلکہ انھیں عملی جامہ بھی پہنایا جائے تو کس میں نہی عن المنکر بالید کرنے کا حوصلہ رہے گا۔جو واقعات ہم نے پیش کیے ان کا حاصل یہ ہے کہ عدمِ برداشت و تحمل ہمارا ایک قومی مسئلہ بن چکا ہے جس میں ہر طرح کے لوگ ملوث پائے جاتے ہیں۔اس واقعے پر سامنے آنے والا ایک خاص ردِ عمل بھی دیکھ لیتے ہیں اسی کے ذیل میں اصلاح کے لائحہ عمل کی طرف اشارہ ہو جائے گا۔سانحہ سیالکوٹ کی آڑ میں وطنِ عزیز کے غیر عزیز لبرل حضرات نے اسلامی نظریہ کے خلاف بھی کوشش شروع کر دی۔بی بی سی اردو کی ویب سائٹ پر شائع ہونے والے ایک مضمون میں اس واقعے کو مارچ ۱۹۴۹ء میں دستور ساز اسمبلی سے منظور ہونے والی قرار دادِ مقاصد سے جوڑ دیا گیا کہ اس قرار داد نے پاکستان میں مذہبی حساسیت کی بنیاد رکھ دی۔

https://www.bbc.com/urdu/pakistan-59559233

انتہا پسندی کے لیے قرار دادِ مقاصد کو ذمہ دار ٹھیرانا تنگ نظر ذہن کی متعصبانہ سوچ ہے۔اس لیے کہ قرار دادِ مقاصد کے دوسرے پیرے میں مملکتِ پاکستان کے لیے ایک دستور کی ضرورت کا اظہار کیا گیا ہے اور اندازِ حکومت میں اسلامی تشریح کے مطابق جمہوریت، آزادی، مساوات، رواداری اور معاشرتی انصاف کو ملحوظ رکھنے کی تاکید کی گئی ہے۔بات

بالکل صاف ہے کہ ملک میں جاری متشدد رویے قراردادِ مقاصد کی خلاف ورزی کی وجہ سے ہیں۔ اگر ملک میں دستور کو چلنے دیا جاتا اور بار بار اسے بھاری بوٹوں تلے نہ روندا جاتا۔ مساوات اور رواداری کی قدروں کو فروغ دیا جاتا تو آج ہمارے حالات مختلف ہوتے۔ قراردادِ مقاصد میں آگے چل کر حکومت کی ایک ذمہ داری کے طور پر بیان کیا گیا کہ "مسلمانوں کو اس قابل بنایا جائے کہ وہ انفرادی و اجتماعی طور پر اپنی زندگی کو اسلامی تعلیمات و مقتضیات کے مطابق جو قرآن و سنتِ نبوی میں متعیّن ہیں ڈھال سکیں اور اس امر کا قرار واقعی انتظام کیا جائے کہ اقلیتیں آزادی کے ساتھ اپنے مذہب پر عقیدہ رکھ سکیں اور ان پر عمل کر سکیں اور اپنی ثقافتوں کو ترقی دے سکیں"۔ اگر حکمرانوں نے اپنی ذمہ داریاں ادا کرتے ہوئے قراردادِ مقاصد کی روح کے مطابق نظامِ تعلیم و تربیت تشکیل دے کر عوام و خواص کے کرداروں کی اسلامی تشکیل کی ہوتی تو آج ہمیں یہ دن نہ دیکھنا پڑتے اور نہ ہی ہمیں سری لنکا کے سامنے "شرمندہ" ہونا پڑتا۔ اصل میں ہمیں شرمندہ ہونے کی ضرورت ہے تو اپنے رب کے سامنے، کہ ہم اپنی کوتاہیوں پر انفرادی اور اجتماعی شرمندگی کا اظہار کر کے اصلاح کے لیے کوشاں ہو جائیں تو یہی سچی توبہ ہے: «النَّدَمُ تَوْبَةٌ» (ابن ماجہ) "شرمندگی ہی توبہ ہے"۔

*****

مولانا محمد اقبال
رکن شعبہ تحقیق و تصنیف

سورۃ النساء آیت:۱۱۴

﴿لَا خَيْرَ فِي كَثِيرٍ مِنْ نَجْوَاهُمْ إِلَّا مَنْ أَمَرَ بِصَدَقَةٍ أَوْ مَعْرُوفٍ أَوْ إِصْلَاحٍ بَيْنَ النَّاسِ وَمَنْ يَفْعَلْ ذَلِكَ ابْتِغَاءَ مَرْضَاتِ اللهِ فَسَوْفَ نُؤْتِيهِ أَجْرًا عَظِيمًا﴾

”لوگوں کی بہت سی خفیہ سرگوشیوں میں کوئی خیر نہیں ہوتی، الا یہ کہ کوئی شخص صدقے کا یا کسی نیکی کا یا لوگوں کے درمیان اصلاح کا حکم دے۔ اور جو شخص اللہ کی خوشنودی حاصل کے کرنے کے لیے ایسا کرے گا، ہم اس کو زبردست ثواب عطا کریں گے“۔

آیتِ مبارکہ کی تشریح

آیتِ مذکورہ سے پہلے اللہ تعالیٰ نے منافقین کے ان اعمال کا تذکرہ فرمایا جو اللہ تعالیٰ کو پسند نہیں ہیں جبکہ اس آیتِ مبارکہ میں ان اعمال کی تلقین فرمائی گئی ہے جو پسندیدہ اور مطلوب ہیں۔ آیت مذکورہ میں ان اعمال کی تعداد تین بتلائی گئی ہے جن کا بجالانا باعث اجر و ثواب ہے۔ وہ صدقہ و خیرات کی ترغیب دینا، معروف کی دعوت دینا اور اصلاح بین الناس جیسے مہتم بالشان اعمال ہیں۔ ان کی مختصر تشریح پیشِ خدمت ہے: ﴿نَجْوَاهُمْ﴾ النجوى،المسارَّة بالحديث بين اثنين فأكثر. ”النجویٰ؛ دو یا دو سے زیادہ لوگوں کے درمیان خفیہ گفتگو کو کہا جاتا ہے“۔ (التفسير الوسيط للقرآن الكريم ج:۲،ص:۹۰۵،الناشر: الهيئة العامة لشئون المطابع الأميرية) جبکہ امام زجاج رحمہ اللہ فرماتے ہیں: وعرَّفها

بعضُهم :بالحديث الذي يَنْفَرد به اثنان فأَكثر ،سِرًّا أو جهرًا.وعلى كلٍّ، فضمير (نجواهم) للناس عامة ،لأن الحكم عام، "بعض لوگوں نے ہراس گفتگو کو النجوی قرار دیا ہے جو دو یا دو سے زیادہ لوگوں کے درمیان ہو، خواہ وہ پست آواز سے ہو یا بلند آواز سے ہو۔ جبکہ دونوں حالتوں میں اس کی ضمیر عام لوگوں کی طرف لوٹتی ہے کیونکہ اس کا حکم عام ہے"۔(التفسير الوسيط للقرآن الكريم ج:۲،ص:۹۰۵،الناشر: الهيئة العامة لشئون المطابع الأميرية)

﴿بِصَدَقَةٍ﴾ ضيافة أو إقراض غيره ،"ضیافت و مہمان نوازی یا کسی کو قرض فراہم کرنا"۔(دَرْجُ الدُّرر في تَفسِيرِ الآيِ والسُّوَر ج:۲،ص:۶۳۲،الناشر :مجلة الحكمة ،بريطانيا)

﴿أَوْ مَعْرُوفٍ﴾ :هو ما عُرِف حسنُه شرعا أَو عرفا ،فينتظم أَصنافَ البرّ والخير، "معروف ہر اس کام کو کہتے ہیں جو عرفاً اور شرعاً محمود ہو، پس نیکی اور خیر کی تمام اصناف کو معروف شامل ہے"۔(التفسير الوسيط للقرآن الكريم ج:۲،ص:۹۰۵،الناشر: الهيئة العامة لشئون المطابع الأميرية)

﴿أَوْ إِصْلَاحٍ بَيْنَ النَّاسِ﴾ تأليف بينهم ،"لوگوں کے درمیان محبت و الفت پیدا کرنا"۔(دَرْجُ الدُّرر في تَفسِيرِ الآيِ والسُّوَر،ج:۲،ص:۶۳۲،الناشر:مجلة الحكمة ، بريطانيا)

اس آیت مبارکہ میں یہاں اس بات کی طرف توجہ دلائی جارہی ہے کہ لوگوں کے وہ باہمی مشورے اور تدبیریں جو محض غیبتوں، لغویات اور معصیت یا کسی انسان کو نقصان پہنچانے کے لیے ہوں ان میں کوئی خیر نہیں ہے۔ کیونکہ عام طور پر لوگوں کے زیادہ تر مشورے آخرت کی فکر اور انجام پر غور کرنے سے آزاد ہوتے ہیں، اس بنا پر ان میں کوئی بھلائی نہیں ہوتی۔ البتہ لوگوں کے ایسے مشوروں اور سرگوشیوں میں ضرور خیر اور بھلائی ہے جو صدقہ و خیرات کی ترغیب دینے، نیکی کا حکم کرنے اور لوگوں میں صلح کرانے پر مشتمل ہوں، ان تین اعمال کے مخالف جتنی سرگرمیاں ہیں وہ آخرت کے اعتبار سے مفید نہیں ہیں۔ ان میں سے پہلے صدقے کا ذکر کیا گیا ہے، صدقے کے حکم میں صدقاتِ واجبہ اور صدقاتِ نافلہ دونوں

آتے ہیں اور اسی طرح دوسرے مسلمان بھائی کو قرض دینا اور اس کی ضیافت کرنا بھی صدقے میں شامل ہے۔ جبکہ معروف نیکی کے ہر کام کو کہا جاتا ہے، اس کے متعلق مفتی اعظم پاکستان حضرت مفتی محمد شفیع رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''امر بالمعروف، ہر نیکی کے حکم اور ترغیب کو شامل ہے، جس میں مظلوم کی امداد کرنا، حاجت مندوں کو قرض دینا، گم شدہ کو راستہ بتا دینا وغیرہ سب نیک کام داخل ہیں اور صدقہ اور اصلاح بین الناس بھی اگرچہ اس میں داخل ہے، لیکن ان کو تخصیص کے ساتھ علیحدہ اس لیے بیان کیا گیا کہ ان دونوں کا نفع متعدّی ہے اور ان سے ملت کی اجتماعی زندگی سدھرتی ہے۔ نیز یہ دونوں کام خدمتِ خلق کے اہم ابواب پر حاوی ہیں۔ ایک جلب منفعت یعنی خلق اللہ کو نفع پہنچانا، دوسرے دفع مضرت، یعنی لوگوں کو تکلیف اور رنج سے بچانا۔ صدقہ نفع رسانی کا اہم عنوان ہے، اس لیے جمہور علماء تفسیر کا قول ہے کہ اس جگہ صدقہ عام ہے جس میں زکوٰۃ، صدقاتِ واجبہ بھی داخل ہیں اور نفلی صدقات بھی، اور ہر نفع جو کسی کو پہنچایا جائے''۔ (معارف القرآن جلد ۲، ص:۵۴۶) اسی طرح امر بالمعروف کے متعلق رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے: «كَلَامُ ابْنِ آدَمَ كُلُّهُ عَلَيْهِ لَا لَهُ إِلَّا أَمْرٌ بِمَعْرُوفٍ أَوْ نَهْيٌ عَنْ مُنْكَرٍ أَوْ ذِكْرُ اللهِ عَزَّ وَجَلَّ» (شعب الإيمان، حديث:۵۱۱) ''ابن آدم کا کلام اس کے لیے وبال ہے، سوائے اس کے کہ اس نے نیکی کا حکم دیا ہو یا برائی سے روکا ہو یا اللہ کے ذکر میں مشغول ہو''۔ راوی کہتے ہیں حضرت سفیان ثوری رحمہ اللہ سے کسی نے مذکورہ حدیث کے متعلق کہا کہ یہ کتنی ہی سخت حدیث ہے! تو حضرت سفیان ثوری رحمہ اللہ نے فرمایا: کیا آپ نے اللہ تعالیٰ کا یہ قول نہیں سنا ہے: ﴿لَا خَيْرَ فِي كَثِيرٍ مِنْ نَجْوَاهُمْ﴾؟ یہ تو بالکل اس حکم کے عین موافق ہے، اور کیا آپ نے نہیں سنا ہے اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿والعصر إن الإنسان لفي خسر﴾؟ یہ تو بعینہ یہی حکم ہے۔ (التفسير الكبير، ج:۱۱، ص:۲۱۸، دار إحياء التراث العربي بيروت)

آیتِ مبارکہ میں مذکور تین اعمال میں سے تیسرا عمل اصلاح بین الناس بھی ایک مہتم بالشان عمل ہے، اس کی اہمیت کا اندازہ حضور ﷺ کے اس ارشادِ مبارک سے لگایا جاسکتا ہے: «عَنْ أَبِي الدَّرْدَاءِ، قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: أَلَا أُخْبِرُكُمْ بِأَفْضَلَ مِنْ دَرَجَةِ الصِّيَامِ وَالصَّلَاةِ وَالصَّدَقَةِ؟ قَالُوا: بَلَى! قَالَ: صَلَاحُ ذَاتِ الْبَيْنِ، فَإِنَّ فَسَادَ

ذَاتِ البَيْنِ هِيَ الحَالِقَةُ»(سنن الترمذي، حديث:٢٥٠٩)"حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے فرمایا: کیا میں تمھیں ایسی چیز کے بارے میں نہ بتاؤں جو درجے کے اعتبار سے صلاۃ، صوم اور صدقے سے بھی افضل ہے ؟صحابہ کرام نے عرض کیا: کیوں نہیں ؟ضرور ارشاد فرمائیں !آپ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے فرمایا: وہ دو بندوں کے درمیان صلح کرادینا ہے ،اس لیے کہ آپس کی پھوٹ دین کو مونڈ دینے والی ہے" ۔ الغرض لوگوں کی باہمی رنجشوں کے خاتمے کے لیے کوششیں کرنا اور دو بندوں کے درمیان میل جول کرادینا ایک ایسا عظیم الشان عمل ہے کہ جس کے لیے اگر ظاہری طور پر جھوٹ بولنا پڑے تو اس پر بھی گناہ نہیں ہے۔ حضرت ام کلثوم بنت عقبہ رضِی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ نبی صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے ارشاد فرمایا:«لَيْسَ الْكَاذِبُ بِأَنْ يَقُولَ الرَّجُلُ فِي إِصْلَاحِ مَا بَيْنَ النَّاسِ» (مسند احمد)"وہ شخص جھوٹا نہیں کہلاتا جو لوگوں کے درمیان صلح کرانے کے لیے کوئی بات کہہ دیں"۔

لہذا آیت مبارکہ میں مذکور اعمال کے سوا جتنی خفیہ، علانیہ تدبیریں اور مشورے ہیں، سب میں عموماً آخرت کے اعتبار سے فائدہ نہیں ہوتا بلکہ نقصان کا اندیشہ ہے۔ جبکہ یہ تین کام ؛صدقے کی ترغیب دینا، نیکی پر ابھارنا اور لوگوں کے درمیان صلح کرانا ایسے کام ہیں جو آخرت کے اعتبار سے باعث اجر ہیں۔ مگر یہاں بھی شرط یہ ہے کہ یہ کام محض اللہ کی خوشنودی کے واسطے انجام دینے چاہییں اور ان کاموں کے بجالانے میں اخلاص پیدا کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ آیت کے آخر میں اس طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ یہ عظیم الشان کام اس وقت مقبول ہیں جب ان میں اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی تلاش کی جائے نہ کہ کسی نفسانی خواہش کی نیت ہو۔ اللہ تعالیٰ ہمیں ان تین اعمال کی بجاآوری کی توفیق عطا فرمائیں۔ آمین

*****

ابنِ عباس
معاون قلم کار

بردباری

عَنْ سَهْلِ بْنِ سَعْدٍ السَّاعِدِيِّ رضي الله عنه قَالَ قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «اَلأَنَاةُ مِنَ اللهِ وَالعَجَلَةُ مِنَ الشَّيْطَانِ»

”حضرت سہل بن سعد الساعدی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”بردباری اللہ کی طرف سے ہے اور جلد بازی شیطان کی طرف سے ہے“۔(سنن ترمذی)

وعن أنس بن مالك رضي الله عنه قال: قال رسول الله ﷺ: «التَّأَنِّي مِنَ الله وَالعَجَلَةُ مِنَ الشَّيطَان»

”سیدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”ٹھہراؤ اللہ کی طرف سے ہے اور جلد بازی شیطان کی طرف سے ہے“۔(مجمع الزوائد)

تشریح

(أَنَاةُ) کا مادہ لغوی (أ ن ی) ہے (أَنَى يَأْنِي أَنَاةً) کا معنی ہے کسی کام کا وقت آجانا۔ اردو ترکیب ”آنِ واحد“ میں آن اسی سے ماخوذ ہے یعنی ایک ہی وقت میں، یکبارگی۔ (أَنَاةُ) بطور اصطلاح آئے گا تو اس کا معنی ہوگا کسی کام کی ابتدا کرنے میں جلد بازی نہ کرنا بلکہ کچھ وقت لینا تاکہ سوچنے سمجھنے کا موقع مل سکے۔ عربی لغت میں اس کا ایک معنی ضبطِ نفس بھی بتایا گیا ہے

یعنی خود پر قابو رکھنا اور کسی بات پر ایک دم اپنا ردِ عمل ظاہر نہ کرنا۔ ہم نے (أَنَاةُ) کا ترجمہ بردباری کیا ہے اردو لغت میں اس کے دوسرے مترادفات کے طور پر ٹھہراؤ، سنجیدگی، سہار اور ضبط وغیرہ پائے جاتے ہیں۔ قاضی عیاض رحمۃ اللہ علیہ نے اس کی تعریف کرتے ہوئے فرمایا ہے: (تربصُه حتى نظر في مصالحه ولم يعْجل) ''بندے کا جلدی نہ کرنا بلکہ کچھ ٹھہر کر اس کام کی مصلحتوں میں غور کر لینا''۔ ایک کمزور درجے کی حدیث میں الفاظ آتے ہیں: «إِذَا هَمَمْتَ بِأَمْرٍ فَتَدَبَّرْ عَاقِبَتَهُ» (احیاعلوم الدین) ''جب تم کسی کام کا ارادہ کرو تو اس کے انجام پر غور کرو''۔ ابن حجر الھیتمی رحمۃ اللہ علیہ اس کی وضاحت کرتے ہوئے کہتے ہیں: التَّأَنِّي فِي الْأُمُورِ حَتَّى يَتَبَيَّنَ حُسْنُهَا مِنْ قُبْحِهَا ''کاموں کی ابتدا کچھ ٹھہر کر کرنا یہاں تک کہ ان کاموں کا حسن وقبح واضح ہو سکے''۔ اسی جملے سے (تأَنِّي) یا (أَنَاةُ) کے اللہ کی طرف سے ہونے کا مطلب معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ انسان کا ہادی ہے وہ کبھی تو مختلف امور کے حسن وقبح (یعنی خوبی یا برائی) کو واضح کرتا ہے اور کبھی بغیر واضح کیے حسن کو اختیار کرنے اور قبح سے اجتناب کا حکم دیتا ہے تو چونکہ (تأَنِّي) یا (أَنَاةُ) ''تحمل وبردباری'' حسن وقبح کے علم یا اختیار واجتناب کا ایک ذریعہ ہے اس لیے اسے اللہ کی طرف سے قرار دیا گیا۔ اللہ کی طرف سے ہونے کا ایک مطلب یہ بھی بیان کیا گیا کہ اس کی صلاحیت اللہ نے انسان میں رکھی ہے اور یہ اللہ کو خوش کرنے والی ایک صفت ہے۔ (اَلعَجَلَةُ) کا عربی میں ترجمہ سرعت سے کیا گیا ہے اردو میں اس کا ترجمہ جلدی یا جلد بازی کیا جاتا ہے۔ اس کی تعریف میں کہا گیا: فعل الشيء قبل وقته اللائق به ''کسی کام کا مناسب وقت آنے سے پہلے اسے کر گزرنا''۔ عجلت کو شیطان کی طرف نسبت دینا بتاتا ہے کہ یہ شیطانی فعل ہے اس لیے کہ جب شیطان کو اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کے سامنے سجدہ کرنے کا حکم دیا تو اس نے کچھ ٹھہر کر اللہ تعالیٰ کے اس حکم پر غور وفکر کر کے اس کی اہمیت اور اپنے انکار کے نتائج پر غور کر کے اس کی قباحت کو سمجھنے کی کوشش نہیں کی اور اللہ کا حکم ماننے سے انکار کر دیا۔ عجلت کو شیطان کی طرف سے قرار دینے کا ایک مطلب یہ بھی ہے کہ شیطان اس طرزِ عمل کو پسند کرتا ہے اور انسان کو اس کی طرف ابھارتا بھی ہے اس لیے کہ اس سے نہ صرف انسان کے غلط کام میں ملوث ہونے کی اسے امید ہوتی ہے بلکہ اگر انسان نیک کام بھی کر رہا ہو تو اس کام میں غلطی پیدا ہو جانے کا امکان ہو

جاتاہے۔اہل عرب کا مقولہ ہے:العجلة أمَّ الندامات ''جلد بازی شرمندگی کی ماں ہے''۔عربی کا محاورہ ہے:اَلتأنِّي السلامة وفي العجلة الندامة ''بردباری وتحمل میں سلامتی ہے اور عجلت میں ندامت ہے''۔انسان کی جبلی ساخت میں عجلت کا مادہ رکھا گیا ہے۔اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:﴿وَكَانَ الْإِنْسَانُ عَجُولًا﴾ (بنی اسرائیل:١١)''انسان ہے ہی اتاؤلا''۔ایک مقام پر فرمایا:﴿خُلِقَ الْإِنْسَانُ مِنْ عَجَلٍ﴾ (الانبیاء:٣٧)''انسان کو عجلت سے پیدا کیا گیا ہے''۔علامہ ابن عاشور رحمہ اللہ فرماتے ہیں:''انسان کو جلدی کے مادے سے بنانا،اس بات کا استعارہ ہے کہ انسان کی جبلت میں عجلت کا مادہ رکھا گیا ہے اور انسان میں اس وصف کے بکثرت پائے جانے کو یوں بیان کیا گیا کہ گویا وہ اسی سے بنا ہے''۔البتہ انسان اپنے نفس کے خلاف مجاہدہ کر کے اپنی عجلت میں خاطر خواہ کمی لا سکتا ہے۔جیسا کہ ایک حدیث میں فرمایا:«مَنْ يَتَصَبَّرْ يُصَبِّرْهُ اللهُ» (البخاری)''جو(بہ تکلف)صبر کرنے کی کوشش کرے گا اللہ اسے صبر کی توفیق دے گا''۔رسول اللہ ﷺ نے قبیلہ عبد القیس کے سردار منذر الاَشَجّ رضی اللہ عنہ کی تحسین کرتے ہوئے فرمایا:«إِنَّ فِيكَ خَلَّتَيْنِ يُحِبُّهُمَا اللهُ الْحِلْمُ وَالْأَنَاةُ» (سنن ابی داؤد)''بے شک تم میں دو ایسی صفات ہیں جنھیں اللہ پسند کرتا ہے حلم اور بردباری''۔حلم کا ایک معنی دانش مندی اور دور اندیشی ہے اور یہ بُردباری اور تانِّي کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔اسی طرح یہ ایک خاص قسم کے رویے پر بھی دلالت کرتا ہے اور حدیث منذر الاشج رضی اللہ عنہ میں یہ اسی آخری معنوں میں استعمال ہوا ہے۔یہ معنی اُردو کے لفظ تحمل سے واضح کیا جا سکتا ہے اور اس کا مفہوم صبر کے نزدیک ہے۔عربی لغت میں اس کی تعریف یوں کی گئی ہے:سكون عند غضب أو مكروه مع قدرة وقوّة ''غصے کے موقع پر،یا کسی ناپسندیدہ امر کے ظہور کے وقت باوجود قدرت و طاقت کے پر سکون رہنے کو حلم کہا جاتا ہے''۔قاضی عبد النبی احمد نگری رحمۃ اللہ علیہ نے جامع العلوم فی اصطلاحات الفنون میں حلم کی تعریف کرتے ہوئے لکھا ہے:هُوَ الطُّمَأْنِينَة عِنْد سُورَة الْغَضَب وَقيل تَأْخِير مُكَافَأَة الظَّالِم ''غصہ آنے کے موقع پر اطمینان کا مظاہرہ کرنا اور یہ بھی کہا گیا کہ کسی ظلم کا بدلہ دینے میں تاخیر کرنا''۔تو حلم کے معنی

میں الاناۃ کا مفہوم یعنی عجلت نہ کرنا، سوچ سمجھ کر ٹھہراؤ کے ساتھ فیصلہ کرنا بھی شامل ہے البتہ اس میں صبر کا مفہوم اضافی طور پر شامل ہے یعنی غصے یا بدلہ لینے کے موقع پر بھی تانی اور بردباری کا مظاہرہ کرنا، جذبات سے مغلوب نہ ہونا بلکہ عقل کی روشنی میں ٹھنڈے دل سے فیصلہ کرنا۔ حلم اور اناۃ میں قدرے فرق بھی ہے جسے ابوہلال العسکری نے الفروق اللُغویہ میں واضح کیا ہے: الأناة التَّمهُّل فِي تَدْبِير الْأُمُور ومفارقة التَّعْجِيلو الحِلْم هُوَ الْإِمْهَال بِتَأْخِير الْعقَاب الْمُسْتَحق ''بردباری کاموں کی تدبیر میں مہلت حاصل کرنا اور عجلت کو ترک کرنا ہے (عمل سے پیچھے رہتے ہوئے سوچ و فکر کرلینا) جبکہ حلم کسی مستحق کو سزا دینے میں جلدی کے بجائے تاخیر کرنا ہے''۔ جب رسول اللہ ﷺ نے اس صفت کی بنیاد پر حضرت منذر الاشج رضی اللہ عنہ کی تحسین فرمائی تو انھوں نے پوچھا: يَا رَسُولَ اللهِ أَنَا أَتَخَلَّقُ بِهِمَا أَمْ اللهُ جَبَلَنِي عَلَيْهِمَا ''یارسول اللہ ﷺ حلم اور بردباری کی یہ صفات میں نے خود پیدا کی ہیں یا اللہ نے میری جبلت میں انھیں رکھ دیا ہے تو نبی کریم ﷺ نے فرمایا: «بَلِ اللهُ جَبَلَكَ عَلَيْهِمَا» ''بلکہ اللہ نے یہ دونوں صفات جبلی طور پر تمھارے اندر رکھ دی ہیں''۔ اس کا یہ مطلب تو ہے ہی کہ حضرت منذر الاشج رضی اللہ عنہ میں یہ دو صفات خصوصی طور پر ودیعت کر دی گئیں تھیں لیکن اس کا یہ مطلب بھی ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان صفات کی صلاحیت ان کی جبلت میں رکھ دی ہے اور ایسا تمام انسانوں کے ساتھ ہوتا ہے کہ اخلاقِ عالیہ کی صلاحیت انسان کی جبلت میں رکھ دی جاتی ہے پھر انسان اپنی محنت سے ان صفات کو بڑھا کر بروئے کار لا سکتا ہے۔ جیسا کہ ایک حدیث میں فرمایا: «إِنَّما الْحِلْمُ بِالتَّحَلُّمِ» (مجمع الزوائد) ''بے شک حلم تو برداشت کرنے سے آتا ہے''۔ مطلب یہ کہ غصے کے اظہار اور ردعمل کے وقت انسان اپنے نفس کو بے قابو نہ ہونے دے اور حلم کی اہمیت و فوائد اور عجلت اور طیش کے نقصانات سے واقفیت حاصل کرتا رہے تو آہستہ آہستہ انسان میں ودیعت کردہ صفتِ حلم اس کی فطرت ثانیہ بن جاتی ہے پھر وہ آسانی سے اس صفت پر عمل پیرا ہو سکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ہمیں ان صفات کو اختیار کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

* * * *

شیخ الاسلام حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی دامت برکاتہم العالیہ
صدر وفاق المدارس العربیہ پاکستان و نائب صدر جامعہ دارالعلوم کراچی

آہ! حضرت مولانا سید ابو الحسن علی ندوی رحمۃ اللہ علیہ

اللہ تعالیٰ نے یہ دنیا ایسی بنائی ہے کہ اس میں غم اور خوشی، راحت اور تکلیف دونوں چیزیں ساتھ ساتھ چلتی ہیں۔ نہ یہاں خوشی خالص ہے نہ غم خالص، اس لیے یہاں غموں اور صدموں کا پیش آنا نہ کوئی اچنبھے کی بات ہے نہ کوئی غیر معمولی چیز، لیکن بعض صدمے ایسے ہوتے ہیں کہ ان کا اثر پوری امت پر پڑتا ہے اور ان کے عالمگیر اثرات کی وجہ سے ان کا زخم مندمل ہونا آسان نہیں ہوتا۔ پچھلے مہینے (رمضان المبارک ۱۴۲۰ھ میں) ایک ایسا ہی عظیم صدمہ مفکرِ اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی وفات کا پیش آیا جس نے ہر اس شخص کو ہلا کر رکھ دیا جو حضرت مولانا، ان کی شخصیت اور ان کی خدمات سے واقف ہے۔ إنا لله و إنا إليه راجعون

حضرت مولانا سید ابوالحسن ندوی قدس سرہ ہمارے دور کی ان عظیم شخصیات میں سے تھے جن کے محض تصور سے دل کو ڈھارس اور روح کو یہ اطمینان نصیب ہوتا تھا کہ قحط الرجال کے اس زمانے میں بفضلہ تعالیٰ ان کا سایۂ رحمت پوری امت کے لیے ایک سائبان کی حیثیت رکھتا ہے۔ علم و فضل کے شناوروں کی تعداد اب بھی شاید اتنی کم نہ ہو، عبادت و زہد کے پیکر بھی اتنے نایاب نہیں، لیکن ایسی شخصیات جو علم و فضل، سلامت فکر، روع و تقویٰ اور اعتدال و توازن کی خصوصیات جمع کر لینے کے ساتھ ساتھ امت کی فکر میں گھلتی ہوں اور جن کے دلِ دردمند میں عالم اسلام کے ہر گوشے کے لیے یکساں تڑپ موجود ہو، خال خال ہی پیدا ہوتی ہیں اور ان کی وفات کا خلا پر ہونا بہت مشکل ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت مولانا کی انھی

خصوصیات سے نوازا تھا، اور اب ان صفات کا جامع دور دور کوئی نظر نہیں آتا۔

حضرت مولانا اصلاً دار العلوم ندوۃ العلماء، لکھنؤ کے تعلیم و تربیت یافتہ تھے، لیکن اس کے بعد انھیں اللہ تعالیٰ نے دار العلوم دیوبند سے بھی اکتساب فیض کی توفیق عطا فرمائی تھی اور اس طرح ان کی ذات میں برصغیر کے ان دونوں عظیم اداروں کے محاسن جمع فرما دیے تھے پھر علم ظاہر کے اس مجمع البحرین کو اللہ تعالیٰ نے علمِ باطن کا بھی حصہ وافر عطا فرمایا۔ انھوں نے حضرت مولانا شاہ عبدالقادر صاحب رائے پوری رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت وصحبت سے فیض حاصل کیا۔ اور طریقت کے میدان میں بھی حضرت رائے پوری قدس سرہ کے خلیفۂ مجاز کی حیثیت سے آپ کا فیض دور دور تک پھیلا۔

آپ کی اردو اور عربی تصانیف اتنی ایمان افروز، فکر انگیز اور معلومات آفریں ہیں کہ وہ دل کو ایمان ویقین سے سرشار کرنے کے علاوہ دین کا صحیح مزاج و مذاق انسان پر واضح کرتی ہیں اور اسے افراط و تفریط سے ہٹا کر اعتدال کے اس (جادہ) مستقیم پر لے آتی ہیں جو ہمارے دین کا طرۂ امتیاز ہے۔ ان کی تحریروں میں علم وفکر کی فراوانی کے ساتھ بلا کا سوز وگداز ہے جو انسان کو متاثر کیے بغیر نہیں رہتا۔ خاص طور پر مغربی افکار کی یورش نے ہمارے دور میں جو فکری گمراہیاں پیدا کی ہیں اور عالمِ اسلام کے مختلف حصوں میں جو فتنے جگائے ہیں، ان پر حضرت مولانا کی نظر بڑی وسیع وعمیق تھی اور انھوں نے اپنی تقریر وتحریر کے ذریعے ان فتنوں کی تشخیص اور ان کے علاج کی نشاندہی اتنی سلامت فکر کے ساتھ اتنے دلنشین انداز میں فرمائی ہے کہ عہدِ حاضر کے مولفین میں شاید ہی کوئی دوسرا ان کی ہمسری کر سکے۔

اللہ تعالیٰ نے انھیں عربی زبان کی تحریر وتقریر پر وہ قدرت عطا فرمائی تھی جو بہت سے عرب اہلِ قلم کے لیے بھی باعث رشک تھی، اس منفرد صلاحیت سے انھوں نے خدمتِ اسلام کا وہ عظیم الشان کام لیا جو عربی زبان وادب کے معاصر ماہرین میں سے شاید کسی نے نہ لیا ہو۔ ان کی فصیح وبلیغ عربی تحریروں نے عربوں کو دین کا بھولا ہوا سبق یاد دلایا۔ اور مغرب کی فکری یلغار سے سہمے ہوئے عرب ممالک میں دین کا پیغام اتنی خود اعتمادی، اتنے یقین اور اتنے پر جوش انداز میں پہنچایا کہ آج بے شمار عرب مسلمان اپنی اسلامی بیداری کو ان کی تحریروں کا مرہونِ منت سمجھتے ہیں۔ ان کی تحریر وتقریر میں جو اخلاص و دردمندی اور دلسوزی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی، وہ ان کی سخت سے سخت بات کو بھی مخاطب کے لیے قابلِ قبول بنا دیتی

تھی۔اس کا نتیجہ تھا کہ عربوں پر کھری کھری تنقید کے باوجود عرب ممالک میں ان کی مقبولیت کسی بھی غیر عرب کے مقابلے میں کہیں زیادہ تھی۔ عرب ملکوں کے متعدّد حلقوں سے بھی ان کے مراسم تھے اور وہ اپنے مراسم کو خدمت دین کے لیے استعمال فرماتے تھے اور ان کی بدولت بہت سے منکرات کا سدِّباب ہوا۔ دارالعلوم ندوۃ العلماء کے بارے میں اگر یہ کہوں تو مبالغہ نہیں ہوگا کہ حضرت مولانا کی قیادت نے اس ادارے کو نئی زندگی بخشی۔ یہ ادارہ در حقیقت حضرت مولانا محمد علی صاحب مونگیری نے مسلمانوں کی اہم وقتی ضرورت کا احساس کرتے ہوئے قائم فرمایا تھا اور اس کا مقصد یہ تھا کہ یہاں سے ایسے اہلِ علم پیدا ہوں جو دینی علوم سے آراستہ ہونے کے ساتھ ساتھ عصری علوم سے بھی اتنی واقفیت رکھتے ہوں جو ان کی دعوت کا معاصر تعلم یافتہ حضرات میں زیادہ مؤثر بنا سکے۔ یہ ایک عظیم الشان مقصد تھا، لیکن رفتہ رفتہ اس ادارے میں تاریخ وادب اتنا غالب آتا گیا کہ اس کی دینی چھاپ ماند پڑنے لگی۔ حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمۃ اللہ علیہ نے دار العلوم ندوۃ العلماء کو دوبارہ اپنے اصل مقاصد کی طرف اس حکمت اور بصیرت کے ساتھ لوٹایا کہ اس کی نمایاں خصوصیت بھی بر قرار رہی۔ اس کے ساتھ اس میں ٹھیٹ اسلامی علوم کا معیار بھی پہلے سے کہیں زیادہ بلند ہوا۔ اس کی مجموعی فضا پر تدین، تقویٰ اور انابت الی اللہ کا رنگ بھی نمایاں ہو اور تاریخ وادب کو دین کی دعوت اور مقاصدِ شریعت کا خادم بنا کر اس طرح استعمال کیا گیا کہ یہ ادارہ دعوت وخدمت دین کا ایک اہم مرکز بن گیا جس کی خدمات سے پورے عالم اسلام نے استفادہ کیا۔ حضرت مولانا نے اپنی انتھک جدوجہد سے اس ادارے میں اپنے ہم رنگ علما کی ایک بڑی کھیپ تیار فرمائی جو بفضل تعالیٰ حضرت مولانا کے اندازِ فکر وعمل کی امین ہے اور انھی کے طرز وانداز پر دین کے مختلف شعبوں میں گراں قدر خدمات انجام دے رہی ہے۔

یوں تو حضرت مولانا کی تمام ہی تصانیف ہمارے ادب کا بہترین سرمایہ ہیں لیکن ”تاریخِ دعوت وعزیمت“ اور ”دنیا پر مسلمانوں کے عروج وزوال کا اثر“ اور عالمِ اسلام میں اسلامیت اور مغربیت کی کشمکش“ یہ تین کتابیں ایسی ہیں کہ راقم الحروف نے ان سے خاص طور پر بہت استفادہ کیا اور ان کے ذریعے بہت سی زندگیوں میں فکری اور عملی انقلاب رونما ہوا۔ اس کے علاوہ ان کے بہت سے چھوٹے چھوٹے مقالے جو الگ کتابچوں کی شکل میں شائع ہوئے ہیں، بلا کی تاثیر رکھتے ہیں۔

خاص طور پر ”اسمعوها مني صريحة أيها العرب“ اور ”ترشيد الصحوة الإسلامية“ اور آخر میں وہ مقالے ہیں جنھوں نے دلوں کو جھنجوڑ کر انھیں فکر و عمل کی سیدھی راہ دکھائی۔

عصری ضرورتوں کا احساس ہمارے دور میں بہت سے علما، رہنماؤں اور اہلِ قلم کو ہوا اور انھوں نے اخلاص کے ساتھ دین کی عصری حاجتوں کی تکمیل میں اپنی توانائیاں صرف کیں لیکن بسا اوقات عصری حاجتوں کی فکر نے ان کو دین کی سکہ بند اور ٹھیٹ تعبیر سے ڈگمگا کر اسی راہ اختیار کرنے پر آمادہ کر دیا جو جمہورِ امت اور سلفِ صالحین کے جادہ مستقیم سے ہٹی ہوئی تھی۔ لیکن حضرت مولانا علی میاں قدس سرہ کا معاملہ ان سے کہیں مختلف تھا۔ اس دور کا کوئی بھی حقیقت پسند انسان اس بات سے انکار نہیں کر سکتا کہ وہ امت مسلمہ کی عصری ضروریات کا مکمل احساس و ادراک رکھتے تھے۔ لیکن ان ضروریات کی تکمیل انھوں نے ہمیشہ جمہور امت کے مسلمہ عقائد و نظریات کے دائرے میں رہتے ہوئے کی اور کسی قسم کی مرعوبیت اور معذرت خواہی کی پرچھائیں بھی ان کی تحریروں پر نہیں پڑ سکیں۔

جب مولانا سید ابو الاعلی مودودی صاحب مرحوم نے جماعتِ اسلامی کی بنیاد ڈالی تو وقت کی ایک اہم ضرورت سمجھ کر حضرت مولانا سید ابو الحسن علی ندوی نے بھی ان کا ساتھ دیا۔ لیکن جب ان کے طرزِ فکر و عمل سے اختلاف سامنے آیا تو حضرت مولانا ان سے الگ تو ہو گئے لیکن جماعت اسلامی اور مولانا مودودی صاحب کی مخالفت کو اپنا ہدف نہیں بنایا، بلکہ مغربی افکار کی تردید میں انھوں نے جو قابل قدر کام کیا تھا، اس کی تعریف و توصیف میں کبھی بخل سے کام نہیں لیا۔ اور بالآخر ان کے طرزِ فکر و عمل پر جو عالمانہ تنقید حضرت مولانا نے ”اسلام کی سیاسی تعبیر“ میں سپردِ قلم فرمائی وہ انھی کا حق تھا۔ اس کتاب کے ذریعے انھوں نے مولانا مودودی اور ان کے طرزِ فکر کے حامل دوسرے اہلِ علم سے اپنے اختلاف کو انتہائی متانت کے ساتھ مدلل اور مستحکم انداز میں بیان فرما کر ان بنیادی نکات کی نشاندہی فرمائی جن میں ان حضرات کی سوچ قرآن وسنت کے جادۂ اعتدال سے ہٹ گئی تھی۔

حضرت مولانا کی پوری زندگی ایک جُہدِ مسلسل سے عبارت تھی، دنیا کے کسی بھی خطے میں مسلمانوں کی کوئی تکلیف یا خرابی ان کے دل میں کانٹا بن کر چبھ جاتی تھی اور وہ مقدور بھر اس کے ازالے کے لیے بے چین ہو جاتے تھے۔ ان کی

خود نوشت سوانحِ حیات ’’ کاروانِ زندگی‘‘ کے نام سے چھے جلدوں میں شائع ہوئی ہے اور اس کے مطالعے سے ان کی ہمہ جہتی خدمات کا تھوڑا بہت اندازہ ہوسکتا ہے۔ بلکہ مجھے تو اس بات پر حیرت ہے کہ اتنی مصروف زندگی میں انھوں نے اپنی یہ سوانح کس طرح تالیف فرمائی جس میں ان کی سرگرمیوں کی تفصیلات اتنی جُزرَسی کے ساتھ بیان ہوئی ہیں۔ سچ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کسی سے کام لیتے ہیں تو اس کے اوقات میں بھی برکت عطا فرمادیتے ہیں۔ اس سوانح کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ محض واقعاتِ زندگی کی داستان نہیں ہے بلکہ اس میں قدم قدم پر قاری کے لیے فکرو بصیرت کے نئے نئے پہلو اجاگر ہوتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے انھیں جن ہمہ جہتی خدمات کے لیے چنا تھا ان کے پیش نظر وہ کسی ایک ملک کی نہیں پورے عالم اسلام کی شخصیت تھی۔ میرے والدماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب قدس سرہ کے سامنے جب کبھی حضرت مولانا کا ذکر آتا تو اکثر وہ فرمایا کرتے تھے کہ وہ ’’موفق من اللہ‘‘ ہیں اور جوں جوں حضرت مولانا کی خدمات سامنے آتی گئیں حضرت والد صاحب قدس سرہ کے اس جملے کی حقانیت واضح ہوتی گئی۔ لیکن ان ہمہ جہتی خدمات اور عالمگیر مقبولیت کے باوجود حضرت مولانا تواضع کے پیکر تھے۔ ان کے کسی انداز و ادا میں عجب و پندار کا کوئی شائبہ نہیں تھا۔ قبول حق کے لیے ان کا ذہن ہمیشہ کھلا ہوا تھا اور وہ اپنے چھوٹوں سے بھی ایسا معاملہ فرماتے تھے جیسے ان سے استفادہ کررہے ہوں۔

مجھ ناچیز کے ساتھ حضرت مولانا کی شفقت و محبت اور عنایت کا جو معاملہ تھا اسے تعبیر کرنے کے لیے الفاظ ملنے مشکل ہیں۔ اگرچہ پاکستان اور ہندوستان کے بُعد کی بنا پر مجھے حضرت مولانا سے شرف ملاقات اور حضرت کی صحبت سے مستفید ہونے کے مواقع کم ملے۔ لیکن الحمدللہ خط و کتابت کے ذریعے ان سے تعلق قائم رہا۔ میں نے اپنے بہت سے ذاتی اور اجتماعی مسائل میں حضرت مولانا سے رہنمائی طلب کی اور انھوں نے ہمیشہ بڑی شفقت و محبت کے ساتھ اپنے ارشادات سے نوازا۔ میں ایسے مواقع کی تلاش میں رہتا تھا جب حضرت مولانا کی زیارت ملاقات کا شرف حاصل ہو میرا یہ اشتیاق سوفیصد فطری تھا کہ میرے لیے ان کی حیثیت ایک رہنما کی تھی میں اس بات کا حاجت مند تھا کہ ان کی صحبت جتنی ہوسکے میسر آئے لیکن یہ حضرت مولانا کی شفقت کی انتہا تھی کہ وہ بھی محض اپنے الطاف کریمانہ کی بنا پر مجھے اس سعادت سے بہرہ ور کرنے کی کوشش فرماتے تھے۔ ایک مرتبہ مجمع الفقہ الاسلامی ہند کا اجلاس بنگلور میں ہوتا تھا۔ احقر نے حاضری کا فی الجملہ وعدہ کرلیا

تھا۔ حضرت مولانا کا گرامی نامہ آیا کہ میں نے تم سے ملنے کی خاطر اس سفر کا ارادہ کیا ہے۔ بعد میں اتفاق سے مجھے ایسی مجبوری پیش آگئی کہ میں وہاں نہ پہنچ سکا اور اس وقت ان کی زیارت سے محروم رہا۔ میں اپنی نادانی سے یہ سمجھا تھا کہ حضرت نے احقر کی خاطر داری کے لیے مذکورہ بالا فقرہ لکھ دیا ہوگیا لیکن بعد میں انھوں نے اپنے خطوط میں جس طرح اس پر افسوس کا اظہار فرمایا اور صرف خطوط ہی میں نہیں، اپنی خود نوشت سوانح میں بھی اس واقعے کا جس ذکر فرمایا ہے وہ احقر کو غرقِ ندامت کرنے کے لیے کافی ہے۔ حضرت تحریر فرماتے ہیں: ”۱۴، ۱۵ ذوالقعدۃ ۱۴۱۰ھ ۸، ۹، ۱۰، ۱۱ جون ۱۹۹۰ء کی تاریخوں میں مجمع الفقہ الاسلامی، ہند کا تیسرا عالمی مذاکرہ علمی (سیمینار) بنگلور میں دار العلوم سبیل الرشاد کے احاطے میں منعقد ہونے والا تھا۔ میں نے رائے بریلی کے قیام میں احتیاطاً مجلس کے لیے مقالہ عربی میں تیار کر لیا تھا۔ مقالہ اگرچہ تیار تھا اور بنگلور کا موسم بمبئی سے کہیں زیادہ خوشگوار و خشک بھی ہوتا ہے۔ اس کے باوجود اس موقعے پر سفر کے بارے میں بڑا تردد تھا۔ اس کی وجہ یہ احساس تھا کہ فقہ پر راقم کو حد درجہ اختصاص اور مطالعے کی وسعت و عمق حاصل نہیں جو اس اہم مذاکرۂ علمی میں شرکت کے لیے ضروری ہے۔ اس لیے شرکت سے معذرت کا رجحان غالب تھا پھر صحت وافتادِ طبع کی بنا پر جن علمی مجالس میں بہت ”دھوم دھام“ ہوتی ہے۔ ان میں شرکت کرنے سے بھی طبیعت گریز کرتی ہے لیکن کچھ تو مولانا مجاہد الاسلام صاحب جیسے قابلِ احترام، قدیم اہلِ تعلق اور فاضل داعی سے شرم دامن گیر تھی۔ پھر اس سب پر مستزاد یہ توقع تھی کہ فاضل گرامی قدر اور محبِ محترم مولانا جسٹس محمد تقی عثمانی صاحب بھی اس مذاکرے میں شرکت کے لیے خصوصی طور پر کراچی سے تشریف لانے والے ہیں۔ بمبئی میں بھی مجھے ان کا خط ملا تھا جس میں اس سفر کی آمادگی، تیاری اور ملاقات کے شوق کا ذکر تھا۔ ان کے برادر محترم مولانا مفتی محمد رفیع عثمانی صاحب سے بمبئی میں ملاقات بھی ہوئی تھی جو حیدر آباد کی ایک دعوت پر تشریف لائے تھے۔ اور مولانا تقی عثمانی کی آمد و شرکت کے متوقع تھے۔ بہر حال ان اسباب کی بنا پر بنگلور کے سفر کا فیصلہ کر لیا گیا۔ مولانا محمد تقی عثمانی صاحب غالباً سیٹ نہ ملنے کی وجہ سے تشریف نہیں لا سکے جس کی ذاتی طور پر مجھے بے حد کمی محسوس ہوئی۔ غالباً ان کی عدم شرکت کی بنا پر مجھ ہی کو اس موقر مجلسِ مذاکرہ کا صدر فرض کر لیا گیا۔ (کاروانِ زندگی ص: ۲۲۲ تا ۳۱۸)

اللہ اکبر! تواضع وانکسار اور چھوٹوں پر شفقت وعنایت اور ان کی قدر افزائی کی اس سے بڑھ کر کیا مثال ہو سکتی ہے؟ پھر

بنگلور کے اس سفر میں ملاقات نہ ہوسکنے کا تاثر حضرت پر اس وقت تک رہا جب تک تین ماہ بعد ان سے مکہ مکرمہ میں ملاقات نہ ہوگئی۔ اس ملاقات کا تذکرہ بھی حضرت نے کاروانِ زندگی میں اس طرح فرمایا ہے: ''راقم کی نگاہیں اس موتمر میں پاکستان کے ان مانوس و محبوب چہروں کو ڈھونڈ رہی تھیں جس سے خصوصی دینی و فکری رابطہ اور انس و محبت کا رشتہ ہے۔ اچانک جسٹس مولانا محمد تقی عثمانی، حکیم عبدالرحیم اشرف صاحب اور جسٹس افضل چیمہ صاحب پر نظر پڑی۔ یہ حضرات بھی غالباً اسی شوق و جستجو میں تھے۔ یہ حضرات مغرب کے بعد ڈاکٹر مولوی عبداللہ عباس ندوی صاحب کے مکان پر تشریف لے آئے۔ وہیں عشاکی نماز پڑھی، کھانا نوش فرمایا اور دیر تک مجلس رہی۔ اس طرح بنگلور میں فقہی سیمینار کے موقعے پر جو ۸ تا ۱۱ جون ۱۹۹۰ء کو منعقد ہوا تھا، مولانا محمد تقی صاحب عثمانی سے (جو ایک مجبوری سے تشریف نہیں لا سکے تھے) نہ ملنے کی حسرت پوری ہوگئی۔ دیر تک مجلس رہی جس میں پاکستان کے حالات پر بھی تبصرہ ہوا۔ آخری دن مولانا سمیع الحق صاحب مہتمم دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک سے اچانک ملاقات ہوئی۔ ان سے بھی راقم کا خاص رابطہ ہے۔ اسی مجموعے میں اگر محترمی مولانا ظفر احمد انصاری صاحب کو شامل کرلیا جائے تو جہاں تک راقم کا تعلق ہے یہ پاکستان کے وہ معتمد ترین اور منتخب ترین افراد ہیں جن سے راقم کو خصوصی رابطہ و تعلق ہے۔ اور وہ بھی اس عاجز پر خصوصی کرم فرماتے ہیں۔ مولانا محمد تقی عثمانی صاحب کی راقم کے دل میں جو قدر و منزلت ہے اس سے ان کے احباب بخوبی واقف ہیں اور ان کو بھی غالباً اس کا احساس ہے''۔ (کاروانِ زندگی، ص: ۳۰۴)

حضرت کی خصوصی شفقت کا یہ عالم تھا کہ جب کبھی ان کی کوئی نئی تالیف آتی اس کا ایک نسخہ اپنے دستخط کے ساتھ مجھ ناکارہ کو ضرور بھجواتے۔ اس معاملے میں ڈاک پر اعتماد نہ تھا۔ اس لیے کوشش یہ فرماتے کہ کسی آنے والے کے ذریعے دستی پہنچ جائے۔ اور بعض اوقات احتیاطاً کئی آدمیوں کے ذریعے ایک ہی کتاب کے کئی نسخے بھجوا دیتے تھے۔ جب حضرت کی معرکہ آرا تالیف '' المرتضیٰ'' منظرِ عام پر آئی تو اس کے کئی نسخے احقر کے پاس بھیجے اور حکم فرمایا کہ اس پر البلاغ میں بے لاگ تبصرہ لکھوں۔ احقر نے حکم کی تعمیل کی اور کتاب کی نمایاں خصوصیات ذکر کرنے کے ساتھ چند طالب علمانہ گزارشات بھی پیش کیں۔ حضرت نے ان گزارشات کی ایسی قدر افزائی فرمائی کہ میں پانی پانی ہوگیا۔

اس واقعے کا ذکر بھی حضرت نے '' کاروانِ زندگی'' میں کیا ہے۔ ''المرتضیٰ'' کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔ ''بعض

حلقوں میں کتاب کا استقبال اور ردعمل مصنف کی توقع اور کتاب کی قدر وقیمت کے خلاف ہوا۔ مؤلفِ کتاب کو ایسے خطوط اور تنقید تبصرے بھی ملے جن میں سخت وتیز وتند لہجہ استعمال کیا گیا اور چبھتی ہوئی طنزیہ زبانوں میں کتاب اور مؤلف کتاب کو نشانۂ تنقید وتضحیک بنایا گیا، رسائل کے تبصرے بھی عام طور پر پھیکے اور خانہ پُری کا نمونہ تھے (اس کلیے میں البلاغ کراچی کا وہ منصفانہ، حقیقت پسندانہ اور فراخ دلانہ تبصرہ ایک ممتاز ومستثنیٰ حیثیت رکھتا ہے۔ جو فاضل گرامی جسٹس مولانا محمد تقی عثمانی کے قلم سے نکلا اور رسالہ "البلاغ" رمضان المبارک ۱۴۰۹ھ کے شمارے میں شائع ہوا)۔ (کاروانِ زندگی، ۳۴)

حضرت مولانا کے جو مکاتیب میرے پاس محفوظ ہیں ان کی تعداد بھی خاصی ہے۔ چونکہ ان مکاتیب میں پڑھنے والے کے لیے کوئی نہ کوئی سبق ضرور موجود ہے اس لیے میں ان میں سے چند مکاتیب البلاغ ہی میں الگ سے اشاعت کے لیے دے رہا ہوں ان میں راقم الحروف کے بارے میں شفقت آمیز کلمات ہیں وہ احقر کے لیے سعادت اور فال نیک ضرور ہیں اور دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ مجھے ان کا اہل بننے کی توفیق عطا فرمائیں۔ لیکن انھیں پڑھ کر کوئی صاحب احقر کی حقیقی حالت کے بارے میں کسی غلط فہمی یا خوش فہمی کا شکار نہ ہوں البتہ یہ مکتوب نگار کی عظمت کی دلیل ضرور ہیں کہ وہ اپنے چھوٹوں سے بھی کس عزت افزائی کا معاملہ فرماتے تھے۔ حضرت مولانا نے میری کتاب "عیسائیت کیا ہے؟" بہت پسند فرمائی اور اس کے عربی اور انگریزی ترجمے پر بھی زور دیا جو الحمد للہ ان کی دعاؤں سے شائع ہوا اور عربی ترجمے کے لیے مترجم کی خدمت میں ہدیہ بھی پیش فرمایا اور اس پر مفصل مقدمہ بھی لکھا۔ آخری دور میں حضرت نے میری کتاب "تکملہ فتح الملہم" پر بھی اپنی گوناگوں مصروفیات کے باوجود مبسوط مقدمہ تحریر فرمایا۔

امسال دارالعلوم کراچی کی طرف سے شوال کے آخر میں فضلاے دارالعلوم کی دستار بندی کے لیے سالہا سال کے بعد ایک جلسہ منعقد کرنے کا خیال ہے۔ مقصد یہ تھا کہ اس موقعے پر اکابر علما کا ایک اجتماع بھی ہو جائے۔ اس موقعے پر جن اکابر علما کو دعوت دینے کا خیال تھا ان میں حضرت مولانا کا اسم گرامی سر فہرست تھا۔ چنانچہ احقر نے جمعرات ۲۱ رمضان المبارک کو ندوۃ العلماء میں فون کیا۔ معلوم ہوا کہ حضرت رائے بریلی میں تشریف فرما ہیں۔ وہاں فون کیا تو حضرت اس وقت فون کے پاس نہیں تھے۔ فاضل گرامی جناب مولانا محمد رابع ندوی صاحب سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے بتایا کہ الحمد للہ

حضرت کی صحت بہتر ہے۔ فالج کا جو اثر پچھلے دنوں ہوا تھا۔ بفضلہ تعالیٰ وہ اب زائل ہو چکا ہے اور حضرت کمزوری کے باوجود روزے بھی رکھ رہے ہیں۔ یہ سن کر الحمد اللہ بہت اطمینان ہوا۔ جناب مولانا رابع صاحب نے میرا پیغام حضرت تک پہنچانے کا وعدہ کیا اور فرمایا کہ آپ سے حضرت کو جو محبت ہے اس کے پیشِ نظر وہ اس دعوت کو ضرور اہمیت دیں گے۔ تاہم میں نے ان سے وہ مناسب وقت معلوم کیا جس میں ان سے براہ راست بات ہو سکے۔ مولانا نے فرمایا کہ صبح دس بجے کے قریب حضرت فون کے پاس ہوتے ہیں۔ میں نے ارداہ کیا کہ ان شاء اللہ ہفتے کی صبح کو حضرت سے ہمکلامی کا شرف حاصل کروں گا۔ لیکن اللہ تعالیٰ کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ جمعہ کی رات کو میرے بھتیجے عزیز خلیل اشرف عثمانی صاحب سلمہ نے فون پر بتایا کہ ریڈیو ٹیلیویژن سے حضرت کی وفات کی خبر نشر ہو چکی ہے۔ دل پر بجلی سی گری، مگر اللہ تعالیٰ کے فیصلے پر سرِ تسلیم خم کیے بغیر چارہ نہ تھا۔ اللہ تعالیٰ نے انھیں اپنے پاس بلانے کے لیے رمضان کا مبارک مہینا، جمعہ کا مقدس دن اور وہ وقت منتخب فرمایا جس میں وہ تلاوت قرآن کریم میں مشغول تھے۔ ان کی زندگی جتنی پاکیزہ تھی اللہ تعالیٰ نے موت بھی ایسی ہی پاکیزہ عطا فرمائی۔ إنا لله وإنا إليه راجعون

اس واقعے پر یوں تو ہر مسلمان تعزیت کا مستحق ہے۔ لیکن خاص طور پر حضرت کے اہل خانہ، دارالعلوم ندوۃ العلماء کے منتظمین اور اساتذہ، نیز حضرت کے تمام متوسلین کی خدمت میں البلاغ کی طرف سے پیغام تعزیت پہنچ سکے۔ حضرت مولانا اب دنیا میں نہیں ہیں لیکن انھوں نے جو گراں قدر آثار چھوڑے ہیں۔ وہ ان شاء اللہ رہتی دنیا تک امت کی رہنمائی کریں گے۔

اللهم لاتحرمنا أجره ولا تفتنا بعده، اللهم أكرم نزله ووسع مدخله و أبدله دارا خيراً من داره وأهلا خيراً من أهله وأغسله بماء الثلج والبرد ونقه من الخطايا كما ينقى الثوب الأبيض من الدنس آمين يا أرحم الراحمين

(ماہانہ "البلاغ" ذی قعدہ ۱۴۲۰ھ/فروری ۲۰۰۰ء)

* * * *

مفتی اویس پاشاقرنی

مدیر فقہ اکیڈمی کراچی

خواطرِ ایام

ترکی کے حالیہ سفر میں مکتبۃ الارشاد سے شائع ہونے والی کتاب ”فضل علم السلف علی علم الخلف“ پر نظر ڈالنے کا موقع ملا۔ یہ آٹھویں صدی ہجری کے جلیل القدر امام حافظ ابنِ رجب حنبلی رحمہ اللہ کی عمدہ فکری تالیف ہے۔ اگرچہ بعض جگہ ساداتِ حنفیہ پر جرح پائی جاتی ہے مگر اپنے موضوع پر یہ ایک بہترین تصنیف ہے۔ طالبانِ علومِ دینیہ کے لیے اس کا مطالعہ مفید ہے۔ امامِ موصوف ایک روایت لائے ہیں جو توجہ طلب ہے۔:«إِنَّ مِنَ الْبَيَانِ سِحْرًا وَإِنَّ مِنَ الْعِلْمِ جَهْلًا» (سنن أبي داؤد،كتاب الأدب،باب ماجاء في الشعر) ” بعض بیان جادو اثر ہوتے ہیں اور بعض علم حقیقتًا جہل پر مبنی ہوتے ہیں“۔ یہاں یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ روایت کا پہلا حصہ جو عام طور پر مثبت معنوں میں سمجھا جاتا ہے، اس جگہ منفی معنی پر دلالت کر رہا ہے۔ یعنی ہر شعلہ بیان، قادر الکلام اور فصیح اللسان شخص کی سحر بیانی ضروری نہیں کہ نافع ہی ہو بلکہ یہ ضار و مضر بھی ہو سکتی ہے۔ امام ابنِ رجب الحنبلی رحمہ اللہ اس طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں: وإنما قاله في ذَمِّ ذلك لا مدحا له كمَا يظُنُّ ذلك مَنْ ظَنَّهُ وَمَنْ تَأَمَّلَ سِيَاقَ أَلفاظِ الحديث قَطَعَ بذلك ”بیان و خطاب کے بارے میں آپ ﷺ کا یہ فرمان، اس کی مذمت میں وارد ہوا ہے نہ کہ اس کی مدح و تعریف میں جیسا کہ بعض لوگوں کو اس کے مقامِ مدح میں ہونے کا گمان ہوا ہے۔ جو شخص الفاظِ حدیث کے سیاق پر غور کرے گا اسے یہ بات قطعی طور

پر معلوم ہو جائے گی (کہ یہ مقامِ ذم ہے نہ کہ مدح)'' حدیثِ مندرجہ بالا میں بیان کی سحر انگیزی کے مقامِ ذم میں ہونے کا علم اس حدیث کے شانِ ورود سے بھی حاصل ہوتا ہے۔ سیّدنا عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں: قَدِمَ رَجُلَانِ مِنَ المَشْرِقِ فَخَطَبَا، فَعَجِبَ النَّاسُ لِبَيَانِهِمَا، فَقَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ «إِنَّ مِنَ البَيَانِ لَسِحْرًا» (بخاری شریف) ''مشرق کی طرف سے دو شخص رسول اللہ ﷺ کے پاس آئے اور انھوں نے خطاب کیا۔ لوگ ان کی خطابت سے بہت متاثر ہوئے۔ پس رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''بے شک بعض خطاب تو جادو ہوتے ہیں''۔ صحیح ابنِ حبّان کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ جب مشرقی خطیبوں کی وہ جوڑی اپنی تقریر کا جادو جگا چکی تو ان کے مقابلے پر حضرت ثابت بن قیس رضی اللہ عنہ کھڑے ہوئے: فَتَكَلَّمَ فَعَجِبُوا مِنْ كَلَامِهِ ''انھوں نے کلام کیا لوگ ان کے کلام سے بھی متعجّب ہوئے''۔ اس پر رسول اللہ ﷺ کھڑے ہوئے اور بیان کو سحر انگیزی قرار دینے کے ساتھ یہ بھی فرمایا: «يَا أَيُّهَا النَّاسُ قُولُوا بِقَوْلِكُمْ فَإِنَّمَا تَشْقِيقُ الْكَلَامِ مِنَ الشَّيْطَانِ فَإِنَّ مِنَ الْبَيَانِ سِحْرًا» ''اے لوگو! اپنے عام اور سادہ الفاظ میں بات کہہ دیا کرو کہ لچھے دار گفتگو اور لفاظی کا مظاہرہ کرنا شیطان کی طرف سے ہے، پس بے شک بعض شعلہ بیانیاں تو جادو ہوتی ہیں''۔ اس حدیث کے ایک راوی صَعصہ بن صُوحان رحمہ اللہ، اس مذمت کی وجہ بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں: فَالرَّجُلُ يَكُونُ عَلَيْهِ الْحَقُّ وَهُوَ أَلْحَنُ بِالْحُجَجِ مِنْ صَاحِبِ الْحَقِّ، فَيَسْحَرُ الْقَوْمَ بِبَيَانِهِ فَيَذْهَبُ بِالْحَقِّ ''کبھی حق کسی انسان کے خلاف ہوتا ہے اور وہ انسان حجت بازی میں صاحبِ حق کے مقابلے میں زیادہ اچھی طرح زبان چلاتا ہے اور اپنی لسّانی سے لوگوں پر جادو کر کے حق کو (اپنے حق میں) لے جاتا ہے''۔ (سنن ابی داؤد) قوّتِ بیان کا مقامِ ذم میں ذکر ایک مزید فرمانِ رسول اللہ ﷺ میں ملتا ہے اور یہاں روئے سخنِ کریم ﷺ خطبے کی طوالت کی طرف ہے فرمایا: «إِنَّ طُولَ صَلَاةِ الرَّجُلِ وَقِصَرَ خُطْبَتِهِ مَئِنَّةٌ مِنْ فِقْهِهِ فَأَطِيلُوا الصَّلَاةَ وَاقْصُرُوا الْخُطْبَةَ وَإِنَّ مِنَ الْبَيَانِ سِحْرًا» (مسلم شریف) ''بے شک بندے کی لمبی نماز اور مختصر خطبہ اس کی فقاہت کی نشانی ہے پس تم نماز کو لمبا کرو اور خطبے کو مختصر کرو اور بے شک بعض خطبے تو جادو انگیز ہوتے ہیں''۔ اب آتے ہیں حدیثِ زیرِ مطالعہ کے دوسرے حصے «إِنَّ مِنَ الْعِلْمِ جَهْلًا» کی طرف،

امام ابنِ رجب رحمہ اللہ نے جاہل علم کے مختلف مصداقات نقل کیے ہیں۔پہلا تو یہ کہ أن يَتكَلَّفَ العالِمُ إلى عِلْمِهِ مالا يَعْلَمُ فَيَجْهَلُهُ ذلك "عالم اپنے علم (کے اظہار) میں تکلف سے کام لے کر ان امور میں ملوث ہوجائے جن کا علم وہ نہیں رکھتا تو یہ جہالت کا مرتکب ہورہا ہے"۔ "علم کے پردے میں جہالت" کی دوسری مراد وہ علوم ہیں جو اپنی ذات ہی میں ممنوع اور منبعِ جہالت ہیں۔امام لکھتے ہیں:ويُفَسَّرُ أيضا بأنَّ الْعلمَ الّذي يَضُرُّ ولا يَنْفَعُ جَهْلٌ. لِأَنَّ الْجَهْلَ بِه خَيْرٌ مِنَ الْعِلْمِ به. فإذا كان الجهلُ به خيراً مِنْه فهو شَرٌّ من الجهلِ وهذا كَالسِّحْرِ وغَيْرِه مِنَ الْعُلُومِ الْمُضِرَّةِ في الدِّينِ أو في الدنيا" اور حدیث کی شرح یوں بھی کی جاتی ہے کہ وہ علم جو نقصان تو دیتا ہے لیکن فائدہ نہیں دیتا وہ جہل کی مانند ہے اور ایسے علم سے لاعلم رہنا ہی بہتر ہے۔پس جب ایسے علم سے جہل بہتر ہوا تو یہ علم جہالت سے بھی زیادہ برا ہے اور اس قسم میں جادو وغیرہ اور وہ علوم شامل ہیں جو دینی یا دنیاوی اعتبار سے نقصان دہ ہوں"۔علم میں جہالت کی ایک مثال وہ علوم ہیں جو اصل کے اعتبار سے تو جائز ہیں لیکن ان میں غلو کی وجہ سے وہ جہالت کا ذریعہ بنتے ہیں۔ان میں سے ایک انساب کا علم ہے۔مراسیلِ ابی داؤد میں ایک روایت نقل ہوئی ہے:سرورِ دوعالم ﷺ کے سامنے ایک شخص کا ذکر کیا گیا کہ فلاں بڑا علم والا ہے۔آپ نے فرمایا کس کی بابت علم رکھتا ہے؟عرض کیا گیا:"نسب ناموں کے بارے میں"۔آپ ﷺ نے فرمایا:«علمٌ لا يَنْفَعُ وجَهالَةٌ لا تَضُرُّ» "یہ ایسا علم ہے کہ اس کا نفع کوئی نہیں اور اس سے ناواقفی نقصان دہ نہیں ہے"۔چنانچہ امام ابنِ رجب رحمہ اللہ نے رسولِ خدا ﷺ اور سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا ایک قول نقل کیا ہے:تعلمُوا مِنْ أَنسابِكم ما تَصِلُون به أَرْحَامَكُم ثم انْتهوا، وَتَعلَمُوا مِنَ الْعَرَبِيَّةِ مَا تَعرِفُونَ بِه كتاب اللهِ ثم انتهوا،وتَعْلَمُوا مِنَ النُّجُومِ مَاتَهْتَدَوْنَ بِه في الظلماتِ البَرِّ والبَحْرِ ثم انتهوا "انساب کا اتنا علم حاصل کرو جس سے اپنے رحمی رشتوں کو پہچان لو پھر رک جاؤ،عربی کا اتنا علم حاصل کرو جس سے تم کتاب اللہ کو جان سکو پھر رک جاؤ اور ستاروں کا اتنا علم حاصل کرو جس سے خشکی وتری کے اندھیروں میں راستے پاسکو"۔معلوم ہوا کہ ان علوم میں خوض اور غلو مفید نہیں بلکہ انہماک کا مفید درجہ معلوم کرکے اُس پر اکتفا کرنا چاہیے اور مضر سے احتراز کی کوشش کرنی

چاہیے۔آج جدید سائنس نے جو رویہ بنا رکھا ہے کہ علمِ اشیا(طبعیات) میں لایعنی خوض ایک قابلِ تعریف رجحان بن کر سامنے آیا ہے، یہ اندازِ فکر بھی اسلامی روایت سے میل نہیں کھاتا اور غلو پر مبنی ہے۔علم میں جہالت کی ایک مثال ’’قلتِ عمل اور کثرتِ جدل‘‘ ہے۔امام ابنِ رجب رحمہ اللہ نے شیخ معروف الکرخی کا یہ قول نقل کیا ہے:إذا أرادَ اللهُ بِعبدٍ شَراً أَغْلَقَ عنه بابَ الْعملِ وفَتَحَ له بابَ الجَدْلِ ’’جب اللہ تعالیٰ کسی بندے کے ساتھ برائی کا ارادہ کرتا ہے تو اس کے لیے عمل کا دروازہ بند کر کے جدل (بحث و مجادلے) کا دروازہ کھول دیتا ہے‘‘۔آج ہمارے معاشرے میں دینی موضوعات پر بحث مباحثہ بہت پسند کیا جاتا ہے اور یقیناً یہ خوے بد میڈیا کی پروردہ ہے اور علماے دین بھی اس دنگل کا حصہ بنتے جا رہے ہیں۔جبکہ امام مالک رحمہ اللہ سے کسی نے پوچھا کہ عالم کا رویہ کیا ہونا چاہیے، کیا بحث مباحثہ میں حصہ لے؟آپ رحمہ اللہ نے فرمایا:لا،ولکن يُخْبِرُ بِالسُّنَّةِ فَإِنْ قَبِلَ منه وإلا سَكَتَ ’’سنت کا علم عام کرے، اگر لوگ قبول کرتے ہوں تو فبہا ورنہ خاموشی اختیار کرے‘‘۔امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کا یہ قول بھی، امام ابنِ رجب رحمہ اللہ نے نقل فرمایا ہے:المِراءُ والجِدَالُ في العلمِ يَذْهَبُ بنورِ الْعِلمِ ’’بحث و تکرار اور مجادلہ نورِ علم کو برباد کر دیتا ہے‘‘۔امام مالک رحمہ اللہ کا یہ بھی فرمانِ عالی شان ہے:المراءُ في العلم يُقسي القلبَ ويورثُ الضعنَ ’’علم کی باتوں میں جھگڑا کرنا دل کی سختی اور باہمی عداوت کا ذریعہ ہے‘‘۔بدقسمتی سے آج طالبِ علم اس بات پر فخر کرنے لگے ہیں کہ میں نے فلاں سے بحث کی اور اُسے چت کر دیا وغیرہ جبکہ ہمارے اسلاف کے لیے شرف یہ تھا کہ امام ابراہیم نخعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:ما خاصَمْتُ قَطُّ ’’میں نے کبھی کسی سے بحث نہیں کی‘‘۔علامہ ابنِ رجب الحنبلی رحمہ اللہ نے امام عبد الکریم الجزری رحمہ اللہ کا ایک قول نقل کیا ہے:ما خَاصَمَ ذو وَرِعٍ قَطُّ ’’کوئی صاحبِ تقویٰ بحث میں نہیں پڑتا‘‘۔امام جعفرِ صادق رحمہ اللہ کا قول انھوں نے نقل کیا ہے:إِيَّاكُمْ وَالْخُصُوماتِ في الدينِ فإنَّها تَشْغَلُ القلبَ وتورِثُ النفاقَ ’’دینی معاملات میں جھگڑوں سے بچو، اس لیے کہ وہ دل کو (یادِ الٰہی اور فکرِ آخرت سے) مشغول کر دیتے ہیں اور نفاق کا ذریعہ بنتے ہیں‘‘۔یہ آثار پیش کرنے کے بعد

امام ابنِ رجب رحمہ اللہ تبصرہ فرماتے ہیں: وقَدْ فُتِنْ كثيرٌ مِنَ المتأخرينَ بهذا فَظَنُّوا أنَّ مَنْ كَثُرَ كلامُه وجِدَالُه وخِصَامُه في مسائلِ الدّينِ فهو أَعْلَمُ مِمن ليسَ كذلك وهذا جَهْلٌ محضٌ ''متاخرین کی کثیر تعداد اس معاملے میں مبتلاے آزمائش ہے اور وہ سمجھتی ہے کہ جو مسائلِ دین میں کثرت سے کلام کرتا ہے اور بحث و تکرار اور مجادلے میں مصروف رہتا ہے وہ دوسرے علما کی بہ نسبت زیادہ بڑا عالم ہے اور یہ جہالت کے سوا کچھ نہیں ہے''۔ امام آگے چل کر لکھتے ہیں کہ ''ہمیں ایسے جاہل لوگوں سے پالا پڑا ہے جو بعض بڑھ بڑھ کر بولنے والوں کو متقدمین سے بڑا عالم سمجھتے ہیں۔ بلکہ بعض لوگوں کے مقالات و بیانات کی کثرت کو دیکھ کر انھیں صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین تک سے افضل سمجھتے ہیں''۔ اندازہ فرمائیں کہ امام موصوف اُس دور میں خود کو مبتلاے آزمائش سمجھتے ہیں تو اندازہ کریں کہ ان کے زمانے کے بالمقابل آج کی صورتِ حال کس قدر بگڑ چکی ہے۔ جبکہ سمجھا یہ جاتا ہے کہ جس کے میڈیا پر بیانات جتنے زیادہ ہیں اور جو اختلافی مسائل میں زیادہ کلام کرتا ہے وہ اتنا بڑا عالم ہے! امام نے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا قول نقل کیا ہے: إِنَّكُمْ فِي زَمَانٍ كَثِيرٍ عُلَمَاؤُهُ قَلِيلٍ خُطَبَاؤُهُ، وَسَيَأْتِي بعدكم زَمَانٌ قَلِيلٌ عُلَمَاؤُهُ كثيرٌ خُطَبَاؤُهُ ''بے شک تم ایک ایسے زمانے میں ہو جب کہ علما کثرت سے ہیں اور خطبا تھوڑے ہیں اور عنقریب تمھارے بعد ایسا دور آئے گا کہ علما تھوڑے ہوں گے اور خطبا زیادہ ہوں گے''۔ کتاب کے اختتام پر حافظ ابنِ رجب رحمہ اللہ نے ایک فصل قائم فرمائی ہے جس میں حقیقی اہلِ علم اور غیر حقیقی صاحبان بلکہ مدعیانِ علم کی صفات بیان کی ہیں لکھتے ہیں: وأما مَنْ عِلْمُهُ غيرُ نافعٍ فليس له شُغْلٌ سوى التكبرَ بِنفْسِهِ عَلَى النَّاس، وإظهارَ فَضْلِهِ عليهم ونِسْبَتِهم إلى الجهلِ وَ تَنَقُّصُهم يَرْتَفِع بذلك عليهم وهذا من أَقبَح الخِصَالِ و أرداها ''جو حاملینِ علم غیر نفع مند ہوتے ہیں ان کا اس کے سوا کوئی مشغلہ نہیں ہوتا کہ وہ لوگوں پر تکبر اور اپنی فضیلت کا اظہار کرتے رہتے ہیں۔ سلف کی طرف جہالت کی نسبت کرنا اور ان کے رتبے میں کمی کرکے اپنی فوقیت کو قائم کرنا ان مدعیانِ علم کی قبیح اور ردّی خصلتوں میں سے ہے''۔ اور علمِ نافع کے حامل افراد کی صفات بیان فرماتے ہوئے لکھتے ہیں: وأهلُ العلم النَّافِعِ يُسِيؤونَ الظَّن بأَنْفُسِهم ويُحْسِنُونَ الظَّنَّ بِمَن سَلَفَ مِنَ العلماءِ ويُقِرُّونَ

بِقُلُوبهم وأَنفُسِهِمْ بِفَضْلِ مَنْ سَلَفَ عليهم وبِعِجْزِهِم عن بلوغِ مَرَاتِبِهم وَالوصولِ إليها أو مُقَارَبَتِها" علمِ نافع کے حاملین اپنے بارے میں برا گمان رکھتے ہیں اور علماے سلف کے بارے میں وہ اچھا گمان رکھتے ہیں۔ دل و جان سے علماے سلف کی قدر و منزلت کو تسلیم کرتے ہیں اور ان کے رتبۂ عالی کے برابر رتبہ پانا تو در کنار اس کے نزدیک پہنچنے کو بھی محال سمجھتے ہیں"۔

یہ تھا علم کے میدان میں ہمارے سلفِ صالحین کا رویہ اور ہمیں سلف سے صرف علم ہی اخذ نہیں کرنا بلکہ ان کے علمی رویے کو بھی سیکھنا ہو گا یقیناً برکت اس میں ہے۔

*****

صوفی جمیل الرحمن عباسی

مدیر ماہنامہ مفاہیم و ناظمِ شعبہ تحقیق و تصنیف، فقہ اکیڈمی

بیت المقدس کا تاریخی خاکہ (۷)

شام عہدِ اسلام میں

موضوع پر کلام سے قبل ایک ضمنی بات سمجھ لینی چاہیے اور وہ یہ کہ شام کے دامنِ اسلام میں آنے کے بعد بھی شرارِ رُومی کی ستیزہ کاری جاری رہی۔ اس کا پسِ منظر یوں ہے کہ مسلمانوں نے دونوں پڑوسی طاقتوں، فارس اور روم کو شکست تو دے دی تھی لیکن ان کی شکست میں ایک فرق تھا۔ شاہِ فارس کی پوری سلطنت مسلمانوں نے فتح کر لی تھی اور دنیا میں سے آتش پرستوں کی حکومت کا خاتمہ کر دیا تھا۔ یہ نبی کریم ﷺ کی اس پیش گوئی کے مطابق تھا کہ جب شاہِ فارس نے رسول اللہ ﷺ کے نامۂ مبارک کو چاک کیا تو آپ ﷺ نے فرمایا تھا کہ عنقریب اس کی سلطنت بھی ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے گی۔ لیکن سلطنتِ روم کا معاملہ قدرے مختلف تھا۔ اسلام سے شکست کھا کر اس کی وسعت و طاقت میں تو زوال آیا لیکن وہ اپنی ذات میں قائم رہی۔ اس ضمن میں یہ فرمانِ رسول ﷺ پیش نظر رہنا چاہیے: «فَارِسُ نَطْحَةٌ أَوْ نَطْحَتَانِ ثُمَّ لَا فَارِسَ بَعْدَهَا أَبَدًا وَالرُّومُ ذَاتُ الْقُرُونِ كُلَّمَا هَلَكَ قَرْنٌ خَلَفَ مَكَانَهُ قَرْنٌ أَهْلُ صَخْرٍ وَأَهْلُ بَحْرٍ هَيْهَاتَ لِآخِرِ الدَّهْرِ هُمْ أَصْحَابُكُمْ مَا كَانَ فِي الْعَيْشِ خَيْرٌ» (مصنف ابنِ ابی شیبہ) ''فارس تو تمھاری ایک یا دو ٹکر کی مار ہے پھر اس کے بعد کبھی کوئی سلطنتِ فارس نہ ہو گی البتہ روم کے کئی سینگ ہیں جب بھی کوئی سینگ ہلاک ہو گا دوسرا سینگ اس کی جگہ لے لے گا۔ روم کے سینگ چٹانوں والے اور سمندروں والے ہیں افسوس کہ وہ آخری دور میں بھی جب تک زندگی میں کوئی خیر رہے گی وہ تمھارے مدِ مقابل رہیں گے''۔ تو اس پیش گوئی کے مطابق روم ہمیشہ ہمارے مدِ مقابل رہے اور یہ

مقابلہ حضرت عیسی علیہ السلام کی آمدِ ثانی تک جاری رہے گا۔ تاریخی طور پر مسلمانوں اور رومیوں کا تصادم کئی طریق پر رہا ہے۔ سلطنتِ روم کا عین اور مرکز قسطنطینہ اور دیگر یورپی علاقے تھے۔ ایشیا اور افریقہ کے علاقے سلطنتِ روم کے نو آبادیاتی علاقے یا مقبوضات تھے۔ مسلم روم تصادم کی پہلی صورت مقبوضات میں تصادم کا ہونا تھا۔ مسلمانوں نے خلافتِ راشدہ میں جتنے علاقے فتح کیے ان میں سے کئی ایک مثلاً مصر، طرابلس، آرمینیا، آذر بائیجان، شام و فلسطین رومی مقبوضات تھے۔ ان علاقوں میں مسلم روم کشمکش دو طرح سے جاری رہی۔ پہلی صورت تو یہ کہ رومی اپنے سابقہ مقبوضات میں، اپنے سابقہ محکومین یا اُن علاقوں میں بسے رہنے والے رومیوں کی سرپرستی کر کے انھیں مسلمانوں کے خلاف بغاوت پر آمادہ کرنے کی کوشش کرتے جنھیں مسلمانوں کی طرف سے فرو کرنے کے لیے جہاد کیا جاتا رہا۔ ہم اس کی چند مثالیں پیش کرنے پر اکتفا کرتے ہیں: اسکندریہ، روم کا باجگذار مصری علاقہ تھا۔ ۲۰ ہجری میں اسے حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہما نے فتح کیا تھا۔ ۲۵ ہجری میں اور ایک روایت کے مطابق ۳۲ ہجری میں، یہاں بسنے والے رومیوں نے شاہِ روم قسطنطین بن ہرقل کو خط لکھ کر مسلمانوں کی فوجوں کی قلت کی خبر دیتے ہوئے انھیں حملے کی دعوت دی۔ شاہِ روم نے اپنے ایک کمان دار منویل کو لشکر دے کر بھیجا۔ جس نے یہاں موجود مسلمانوں کو قتل کر کے شہر پر قبضہ کر لیا۔ حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہما جو اس وقت فسطاط میں تھے، انھوں نے اسکندریہ پر حملہ کیا۔ شہر سے باہر رومی فوجوں سے جنگ ہوئی۔ شکست کھا نے کے بعد رومی اسکندریہ میں داخل ہو کر محصور ہو گئے۔ مسلمانوں نے منجنیق نصب کر کے دیواروں کو توڑا اور شہر میں داخل ہو کر قبضہ کر لیا اور منویل کو قتل کر دیا گیا۔ (فتوح البلدان) آرمینیا اور آذر بائیجان دورِ فاروقی میں فتح ہو چکے تھے۔ دورِ عثمانی کے ابتدائی عرصے میں یہاں کے لوگوں نے جزیہ موقوف کر کے بغاوت کی راہ اختیار کی۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے والیٔ کوفہ حضرت ولید بن عقبہ بن ابی معیط رضی اللہ عنہ کو ان کی گوش مالی کے لیے روانہ کیا۔ انھوں نے کئی علاقے فتح کیے جس پر اہلِ آذر بائیجان نے تجدیدِ معاہدہ کی درخواست کی جو قبول کر لی گئی۔ یہاں سے انھوں نے سلمان بن ربیعہ الباہلی رحمۃ اللہ علیہ کو بارہ ہزار کا لشکر دے کر آرمینیا کی جانب روانہ کیا جہاں انھیں فتح نصیب ہوئی۔ (تاریخ ابنِ خلدون) مقبوضات میں تصادم کی دوسری شکل مسلمانوں کی پیش قدمی کی صورت میں پیش آجاتی تھی۔ مسلمان جن علاقوں میں اقدامی طور پر

جہاد کرتے ہوئے پیش قدمی کرتے ان میں سے کئی علاقوں میں رومی اپنے مفادات کے تحفظ یا بہ الفاظِ صحیح اپنے استحصالی نظام کے تحفظ کی خاطر میدان میں آجاتے۔ اس کی مثال کے طور پر دیکھا جاسکتا ہے کہ ۲۵ ہجری میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے عبداللہ بن ابی سرح کو افریقہ میں پیش قدمی کا حکم دیا اور ان کی مدد کے لیے مدینہ سے ایک فوج روانہ کی جس میں حضرت عبداللہ بن عباس، عبداللہ بن عمرو بن العاص، عبداللہ بن زبیر، حضرت حسن بن علی اور حضرت حسین بن علی رضی اللہ عنہم اجمعین شامل تھے۔ یہاں رومی گورنر جرجیر ایک لاکھ بیس ہزار کا لشکر لے کر مسلمانوں کے مقابلے میں آگیا۔ مسلمانوں نے جنگی چال کے طور پر اپنے آدھے لشکر کو دن کے پہلے حصے میں لڑایا اور باقی کو جنگ سے الگ رکھا۔ ظہر کے بعد آرام کرنے والی فوج نے تھکی ماندی رومی فوج پر اچانک ایسا حملہ کیا کہ ان کے چھکے چھوٹ گئے۔ ان کا سالار جرجیر مقتول اور اس کی بیٹی قیدی بنی۔ (تاریخ ابنِ خلدون) تصادم کی تیسری صورت یہ تھی کہ مسلمان سلطنتِ روم کے مرکز کی طرف حملہ آور ہوتے۔ سلطنتِ روم کی ابتدا، حضرت عیسی علیہ السلام کی پیدائش سے ستائیس سال قبل (۲۷، قبلِ مسیح) میں اٹلی کے شہر روم سے ہوئی تھی اور کئی صدیوں تک وہی اس کا دار الحکومت رہا۔ ۳۸۰ عیسوی میں روم کی سلطنت نے عیسائیت اختیار کی اور ۴۷۶ عیسوی سے اس کا دار لحکومت قسطنطنیہ کو بنادیا گیا تب سے وہی رومہ کی عیسائی سلطنت کا دار الحکومت تھا۔ یاد رہے کہ یہ منحرف عیسائیت تھی جو پالزم کے کفر پر مبنی تھی۔ اس طرح قسطنطنیہ کئی صدیوں سے کفر کا مرکز تھا اور قبلۂ دوم فلسطین اور ارضِ پاکِ شام بھی اسی کے تسلط میں تھے۔ دنیا میں توحید کے فروغ، شرک و کفر کے سدِباب اور قبلۂ دوم کو توحید پر قائم رکھنے کے لیے مرکز کفر و شرک، قسطنطنیہ کا زوال ضروری تھا۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے قسطنطنیہ فتح کرنے والی فوج کو بشارت دی تھی۔ اس بشارت کو پانے کے لیے مسلمان حملہ آور ہوتے رہتے تھے اور یہ تصادم کی تیسری صورت تھی۔ تصادم کی چوتھی صورت وہ تھی کہ روم، نورِ خدا کو بجھانے کے لیے مرکزِ توحید بیت المقدس پر حملہ آور ہو کر اسے چھیننے کی کوشش کرتا رہتا۔ ہماری گزارشات کا تعلق تصادم کی انھی آخری دو قسموں سے رہے گا۔

دورِ معاویہ بن ابی سفیان رضی اللہ عنہما

شام کی اکثر و بیشتر فتوحات دوسرے خلیفۂ راشد حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دور میں مکمل ہو چکی تھیں جن کا مختصر بیان

پہلے گذر چکا۔ دورِ فاروقی میں دمشق پر حضرت یزید بن ابی سفیان رضی اللہ عنہما گورنر تھے۔ ۱۸ ہجری میں آپ کے انتقال کے بعد، حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے آپ کی جگہ پر آپ کے بھائی حضرت معاویہ بن ابی سفیان رضی اللہ عنہما کو گورنر بنا دیا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی شہادت (۲۳ ہجری) تک حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ ہی دمشق کے حاکم رہے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں والیٔ فلسطین عبد الرحمن علقمہ کے انتقال پر فلسطین کو بھی حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی عملداری میں دے دیا گیا۔ کچھ عرصے بعد بلقاء، اردن، انطاکیہ، قلیقیہ بھی حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی عمل داری میں داخل کیے گئے۔ ۲۵ ہجری میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو ترقی دے کر پورے شام کا گورنر بنا دیا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت (۳۵ ہجری) تک حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ شام کے گورنر رہے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ چوتھے خلیفۂ راشد بنے۔ لیکن حضرت معاویہ بن ابی سفیان رضی اللہ عنہما کا حضرت علی رضی اللہ عنہ سے اتفاق نہ ہو سکا۔ شام پر حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ حاکم رہے لیکن شام مرکزی خلافت کی عمل داری سے باہر رہا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شہادت (رمضان سنہ ۴۰ ہجری) کے بعد حضرت حسن بن علی رضی اللہ عنہما کے ہاتھ پر بیعت خلافت کی گئی۔ حضرت حسن بن علی رضی اللہ عنہما نے مسلمانوں کی خون ریزی سے بچنے اور اتحاد و اتفاقِ امت کی خاطر حضرت معاویہ بن ابی سفیان رضی اللہ عنہما سے صلح کی اور ان کے حق میں خلافت سے دستبردار ہو گئے۔ یہ نبی کریم ﷺ کی پیش گوئی کے عین مطابق تھا۔ اسی صلح کے ضمن میں حضرت حسن رضی اللہ عنہ کو اپنے ساتھ منبر پر بٹھاتے ہوئے بہ اندازِ تعریف رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تھا: «ابْنِي هَذَا سَيِّدٌ، وَلَعَلَّ اللهَ أَنْ يُصْلِحَ بِهِ بَيْنَ فِئَتَيْنِ مِنَ الْمُسْلِمِينَ (عَظِيمَتَيْنِ)» ”میرا یہ بیٹا سردار ہے اور امید ہے کہ اللہ اس کے ذریعے سے مسلمانوں کے دو عظیم گروہوں میں صلح کرائے گا“۔ (صحیح بخاری، سنن نسائی) ربیع الاول سنہ ۴۱ ہجری میں حضرت معاویہ بن ابی سفیان رضی اللہ عنہما کی خلافت کا انعقاد ہوا اور آپ امت مسلمہ کے پانچویں متفقہ اور بنو امیہ کے پہلے خلیفہ بن گئے۔ آپ اپنی وفات سنہ ۶۰ ہجری تک اس منصب پر فائز رہے۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے شام پر بطور گورنر اور بطور خلیفہ کل چالیس سال حکومت کی۔ باہمی اختلافات کے دورانیے کے علاوہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے

شام پر عمدہ طریقے سے حکومت کی۔ ابنِ کثیر لکھتے ہیں: وَقَدْ أَحْرَزَهُ غَايَةَ الْحِفْظِ وَحَمَى حَوْزَتَهُ، وَمَعَ هَذَا لَهُ فِي كُلِّ سَنَةٍ غَزْوَةٌ فِي بِلَادِ الرُّومِ ” انھوں نے شام کو حد درجے محفوظ شہر بنا دیا اور اس کی حدود کی حفاظت کی اور اس کے ساتھ ساتھ وہ ہر سال روم پر بھی حملہ کیا کرتے “۔ رومیوں کے ساتھ آپ کے معرکوں کا مختصر بیان یوں ہے کہ ۲۴ ہجری میں رومی ایک لشکرِ جرار تیار کرکے شام کی طرف بڑھنے لگے۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے حبیب بن مسلمہ کو ان کی سرکوبی کے لیے روانہ کیا جبکہ خلیفۂ وقت حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے حکم پر اہلِ کوفہ کا ایک لشکر بھی مدد کو آن پہنچا۔ دونوں لشکروں نے نہ صرف ان کے حملے کو پسپا کیا بلکہ آگے بڑھ کر رومی حدود میں داخل ہو کر کئی علاقوں کو تاراج کیا۔ (تاریخ طبری) قبرص ایک شامی جزیرہ تھا۔ یہ عمدہ آب و ہوا، شاندار پھل اور قیمتی معدنیات والی سرزمین تھی۔ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کو خلیفۂ دوم حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی طرف سے یہاں حملہ آور ہونے کی اجازت نہیں مل سکی تھی۔ خلیفۂ سوم حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی طرف سے اجازت ملنے کے بعد آپ نے بحری بیڑا تیار کیا اور ۲۸ ہجری میں جزیرۂ قبرص پر حملہ کیا۔ اس جنگ میں حضرت عبادہ بن صامت الانصاری رضی اللہ عنہ اور ان کی زوجہ محترمہ امِ حرام بنتِ ملحان رضی اللہ عنہا بھی شامل تھیں۔ اس مہم میں نبی کریم ﷺ کا وہ خواب ظہور پذیر ہوا جس میں آپ ﷺ نے اپنی امت کے لوگوں کو سمندر میں سوار ہو کر جہاد کرتے دیکھا تھا۔ جب آپ ﷺ نے اس کی خبر دی تو سیدہ امِ حرام رضی اللہ عنہ کی درخواست پر ان کے لیے دعا کی تھی کہ اللہ آپ کو ان سمندری مجاہدوں میں شامل کرے۔ فتح کے بعد واپسی کے سفر پر امِ حرام رضی اللہ عنہا خچر سے گر کر شہید ہوئیں۔ (تاریخ ابنِ کثیر) ۳۱ ہجری میں رومی بادشاہ قسطنطین بن ہرقل ایک بحری بیڑہ لے کر مسلمانوں کے ہاتھوں افریقہ میں پہنچنے والی ہزیمت کا بدلہ لینے نکلا۔ بحیرۂ روم میں موجودہ ترک علاقے اناضول (اناطولیہ) کے نزدیکی ساحلوں میں مسلمانوں کا ان سے آمنا سامنا ہوا۔ رومیوں کے پاس ایک ہزار جنگی کشتیاں تھیں جبکہ مسلمانوں کے پاس صرف پانچ سو کشتیاں تھیں۔ مسلمانوں کے سالار عبد اللہ بن ابی سرح تھے مسلمانوں نے انھیں پیشکش کی کہ اگر تم چاہو تو خشکی پر اتر کر مقابلہ کریں رومیوں کی طرف سے پانی پانی کی آوازیں آ رہی تھیں مسلمانوں نے اپنی کشتیاں ان کی کشتیوں کے ساتھ باندھ لیں اور دو بدو لڑائی شروع ہوئی۔ یہ ایک خوفناک جنگ تھی، راوی کہتے ہیں کہ دور دور

تک سمندر کا پانی سرخ ہو گیا۔ مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد شہید ہوئی جبکہ رومی تقریبًا دگنی تعداد میں مارے گئے۔ یہاں تک کہ شاہ قسطنطین بن ہرقل بری طرح زخمی ہوا اور بعد میں علاج معالجے کے دوران ہی فوت ہو گیا۔ یوں مسلمانوں کو عظیم فتح نصیب ہوئی اور سمندروں پر رومیوں کی اجارہ داری کا خاتمہ ہوا۔ (تاریخ ابن خلدون) ۳۲ ہجری میں مسلمان ایک بار پھر قسطنطنیہ کی طرف متوجہ ہوئے۔ اس بار دو طرفہ حملہ کیا گیا۔ خشکی کے راستے گورنرِ شام حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ خود حملہ آور ہوئے اور ابنِ کثیر کے مطابق مضیق قسطنطنیہ تک پہنچ گئے۔ جبکہ طرابلس کی طرف سے بُسر بن ابی ارطاۃ رضی اللہ عنہ حملہ آور ہوئے۔ قسطنطنیہ کے نزدیک رومی لشکر سے ایک لڑائی پیش آئی جس میں اگرچہ بیس ہزار رومی قتل کیے گئے لیکن مسلمانوں کا نقصان بھی اتنا ہو چکا تھا کہ انھوں نے آگے بڑھنے کے بجائے پیچھے لوٹنے کا فیصلہ کیا۔ (ابنِ کثیر، مواقف حاسمہ) ابنِ خلدون کے مطابق ۴۲ ہجری میں ایک مسلمان لشکر روم کے بعض علاقوں پر حملہ آور ہوا جس نے چند مقامات پر انھیں شکست دی۔ ۴۳ ہجری میں بسر بن ابی ارطاۃ رضی اللہ عنہ نے حملہ کیا اور قسطنطنیہ کے نزدیک پہنچ گئے۔ ۴۴ ہجری میں حِمص کے گورنر حضرت عبد الرحمن بن خالد بن ولید رضی اللہ عنہما، روم پر حملہ آور ہوئے جو دو سال بعد شام واپس آئے۔ ۴۸ ہجری میں عبد اللہ بن قیس الفزاری نے اسی سال، عبد الرحمن القطبی، مالک بن ہبیرۃ الیشکری اور عقبہ بن عامر الجھني نے سمندری راستے سے حملہ کیا ۴۹ ہجری میں مالک بن ہبیرہ نے پھر حملہ کیا اور اسی سال عبد اللہ بن کرز الجیلي نے گرمیوں میں جبکہ یزید بن ثمرۃ الرہاوی نے جاڑے میں روم کے بعض علاقوں پر حملہ کیا اسی سال عقبہ بن نافع نے بھی حملہ کیا۔ ۴۹ ہجری میں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے ایک لشکرِ جرار قسطنطنیہ کی طرف روانہ کیا۔ اس کے قائد سفیان بن عوف تھے۔ جلیل القدر صحابہ کرام عبد اللہ ابن عباس، عبد اللہ ابن عمر، عبد اللہ ابن زبیر، ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہم اجمعین اس لشکر میں شامل تھے۔ یزید بن معاویہ بھی اسی لشکر میں تھے اور ابنِ کثیر کے مطابق وہی اس کے قائد بھی تھے۔ أَوَّلُ جَيْشٍ يَغْزُونَ مَدِينَةَ قَيْصَرَ مَغْفُورٌ لَهُمْ۔ بسر بن ابی ارطاۃ رضی اللہ عنہ اپنی بحری فوج کو لے کر حملہ آور ہوئے اور بغیر مضیق ہیلیس الدردنیل تک پہنچ گئے۔ مسلمان فوجیں قصرِ ہبدومون تک پہنچا دی گئیں جو قسطنطنیہ سے چند میل کے فاصلے پر ہے۔ تختِ روما پر اس وقت قسطنطین چہارم تھا، رومیوں نے اپنی پوری طاقت اور وسائل قسطنطنیہ

کے دفاع پر مرکوز کرر کھے تھے۔ کئی مہینے یہ محاصرہ جاری رہا لیکن مسلمان قلعے میں داخل نہ ہو سکے۔ نار یونانیہ کے گولے مسلمانوں پر برسائے جاتے۔ سردیوں کی آمد پر مسلمان محاصرہ ترک کر کے کیزکوس نامی جزیرہ پر چلے گئے جہاں ان کے مراکز قائم تھے۔ ۵۷ ہجری تک یہی حال رہا، گرمیوں میں مسلمان محاصرے پر آجاتے اور سردیوں میں جزیرے پر چلے جاتے۔ لیکن اس طویل مہم کی کامیابی کی کوئی صورت پیدا نہ ہو سکی۔ ہزاروں مسلمان اس مہم میں شہید ہوئے۔ حضرت ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ بھی شہید ہوئے۔ سینکڑوں کشتیاں اور دیگر سامان تباہ ہوا۔ آخر کار خلیفۃ المسلمین اور شاہِ روم میں ایک معاہدۂ امن وجود میں آیا جس کی رو سے چالیس سال تک جنگ نہ کرنے کا فیصلہ ہوا۔ اس امن معاہدے کے چند سال بعد سن ۶۰ ہجری میں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کا انتقال ہو گیا، آپ اپنی وفات سے قبل معاہدے کی مدت کے دوران ہسپانیہ اور افریقہ کی فتح میں مشغول رہے اور اسی عرصے میں مملکتِ قوطِ نصرانیہ فتح کی۔ (موقف جا سمہ ۳۶ تا ۳۸)

جاری ہے

*****

فتاویٰ یسئلونک

دارالافتاء، فقہ اکیڈمی

کاروباری مصروفیت کی بنا پر دوسرے شہر میں قیام کی صورت میں قصر کا حکم

سوال: میری ہمشیرہ جرمنی میں رہتی ہیں، ان کا بزنس کی وجہ سے اکثر یہاں فرانس آنا جانا ہوتا ہے، ہر مہینے ایک یا دو چکر لگتے ہیں اور ہم نے یہاں ان کے لیے ایک کمرہ بھی مخصوص کیا ہوا ہے، اس صورت میں اگر جب وہ پندرہ دن سے کم آئیں تو قصر ادا کریں گی یا پوری نماز پڑھنی ہوگی؟ وطنِ اصلی تو ایک ہوتا ہے تو اس صورت میں کیا حکم ہو گا؟

جواب: اگر پندرہ دن سے کم رہائش کا ارادہ ہو تو نماز قصر کریں۔ کمرہ مخصوص کرنے سے حکم پر کوئی فرق نہیں پڑے گا جب تک وہ وہاں مستقل رہائش یا کم از کم پندرہ یوم کی رہائش کی نیت نہ کریں۔

من خرج من عمارة موضع إقامته قاصدا مسيرة ثلاثة أيام ولياليها بالسير الوسط مع الاستراحات المعتادة صلى الفرض الرباعي ركعتين حتى يدخل موضع مقامه أو ينوي إقامة نصف شهر بموضع صالح لها فيقصر إن نوى في أقل منه. (تنوير الأبصار مع رد المحتار، كتاب الصلاة، باب صلاة المسافر)

والله أعلم بالصواب

۲۸ محرم الحرام ۱۴۴۰ھ بمطابق/۹، اکتوبر ۲۰۱۸ء

* * * * *

سید احمد شاہ معروف بہ احمد فرازؔ (۱۹۳۱۔۲۰۰۸ء)
معروف شاعر

اے شعاعِ سحرِ تازہ

اے شعاعِ سحرِ تازہ نئے سال کی ضو
میرے سینے میں بھڑکتی ہے ابھی درد کی لو

میری آنکھوں میں شکستہ ہیں ابھی رات کے خواب
میرے دل پر ہے ابھی شعلۂ غم کا پرتو

جا بجا زخم تمنا کے مری خاک میں ہیں
کیا ابھی اور بھی ناوک کفِ افلاک میں ہیں

ہر نئے سال کی آمد پہ یہ خوش فہم ترے
پھر سے آراستہ کرتے ہیں در و بام اپنے

پھر سے واماندہ ارادوں کو تسلی دینے
ہم بُھلا دیتے ہیں کچھ دیر کو آلام اپنے

گل شدہ شمعوں کو ہم پھر سے جلا دیتے ہیں
پھر سے ویرانئ قسمت کو دعا دیتے ہیں

یوں ہی ہر سال مرے دیس کی بے بس خلقت
پھر سے ادوار کے انبار میں دب جاتی ہے

خود فریبی کے تبسم کو سجا لینے سے
شدتِ کرب بَھلا چہروں سے کب جاتی ہے

منزلِ شوق کا اب کوئی بھی دلدادہ نہیں
وہ تھکن ہے کہ مسافر سفر آمادہ نہیں

اک نظر دیکھ یہ انبوہ در انبوہ غلام
جو فقط شومئ تقدیر سے وابستہ ہیں

ان کو کچھ بھی تو بجز وعدۂ فردا نہ ملا
یہ جو خود ساختہ زنجیر سے پابستہ ہیں

ان کا ایک ایک نفَس رہن ہے اغیار کے پاس
اب تو غمخوار بھی آتے نہیں بیمار کے پاس

اے نئے سال! کروں میں بھی سُواگت تیرا
تُو اگر دل سے مرے چاک قبائی لے لے

میں تو اُس صبحِ درخشاں کو تَوَنگر جانوں
جو مرے ہاتھ سے کشکول گدائی لے لے

جو مری خاک کو مستِ مئے پِندار کرے
جو مرے دشتِ وفا کو گل و گلزار کرے

*****